سونے کا سنسار

(ناول)

کرشن چندر

ایشیا پبلشرز

۵ بہار گولین ـــــ تیس ہزاری دلّی ۵۴

ایشیا پبلشرز

سونے کا سنسار

مصنف :- کرشن چندر
پروڈکشن :- پون چوپڑا
کتابت :- اعجاز نبی
مطبوعہ :- الجمعیۃ پریس دہلی

ناشر
کملا چوپڑا

قیمت
Rs. 15/-

SONE - KA - SANSAR

انتساب

چھوٹے بھائی اوپندر ؛ کے نام

دلی دعاؤں کے ساتھ

کرشن چندر

26.1.76

سونے کا سنسار

کرشن چندر کا یہ نیا اور عظیم شاہکار ہے۔
اس کی پوری کہانی سوسائٹی کے مختلف طبقات کی اتنی خوبصورت تصویر کشی کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر انگیز ماحول میں خود اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ کہیں ادر تجسس کی فضاؤں میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی رومان انگیز سرگوشیاں کہانی کو اور بھی پُرکشش بنا دیتی ہیں۔
کرشن چندر کی عظمت کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ دلچسپیوں کے سیلاب میں انہوں نے کبھی وقت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس ناول میں بھی ان کا یہ طرۂ امتیاز برقرار ہے۔ آج دنیا جس تیزی سے خود غرضی، مفاد، زر پرستی اور دھوکا دھڑی کے پیچھے بھاگ رہی ہے کرشن چندر کے قلم نے فنکارانہ انداز میں اس کی تفسیر کی ہے۔
یہ کہانی طنز کے بھرپور نشتر لگاتی ہوئی سماج کے مختلف طبقوں کو جو نفسیات پیش کرتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر کو اپنے مشاہدے اور تجربہ پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔
کرشن چندر نے بے حد خوب صورت اور فنکارانہ انداز میں سماج کے مختلف طبقوں کی تصویر کشی کی ہے اور انسانی ذہنیتوں کا بے حد حسین تجزیہ کیا ہے جنہوں نے

یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف دولت ہی زندگی کی حقیقی مسرتوں کا نام ہے۔

اس ناول میں ملنگ بابا کا اچھوتا کردار کہانی کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ملنگ بابا کے کردار میں کہانی کی پوری روح سمٹ آئی ہے۔ دل کی گہرائیوں تک اُتر جانے والی آن کی مترنم آواز اور ہونٹوں پر پھیلی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ، بھٹکے ہوئے ذہنوں کو زندگی کی صحیح منزل کا پتہ بتاتی ہے۔

کرشن چندر کی یہ عظیم کہانی آج کے بھٹکے ہوئے ذہنوں کے لئے ایک خوبصورت پیغام ہے۔

"سونے کا سنسار" ایک لازوال کارنامہ ہے۔

فٹ پاتھ کے قریب بارہ، پندرہ دوکانوں کے باہر لکڑی کا ایک چھجہ ہوا برآمدہ دور تک چلا گیا تھا۔ نبسی لال پرچون فروش کی دوکان کے باہر لکڑی کے ایک ستون سے دلیپ کے طوطے کا پنجرا لٹک رہا تھا۔ اور دلیپ اس ستون سے ٹیک لگا کے ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا دوسری ٹانگ کو دھیرے دھیرے بے خیالی میں جھلاتے ہوئے بازار کی بڑھتی ہوئی رونق دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کا طوطا زور زور سے چلایا۔

"موٹے ــــ موٹے ــــ موٹے۔"

طوطا دلیپ کو "موٹا" کہہ کر پکارتا تھا۔ حالانکہ دلیپ کہیں سے بھی موٹا نہیں تھا۔ ہاں وہ مضبوط اور تگڑے جسم کا ضرور مالک تھا۔ پانچ فٹ گیارہ انچ کے اونچے لانبے فریم میں اس کے جسم پر کہیں فاضل گوشت نہیں تھا۔ اس کا

بھی طوطا اگر اسے "موٹا" کہتا تھا تو شاید اس کے مضبوط اور تگڑے جسم کو دیکھ کر مگر اصل قصہ اس وقت کچھ اور تھا۔ طوطا بھوکا تھا۔ اور جب وہ بھوکا ہوتا تو انتہائی غصہ سے دلیپ کو آوازیں دیتا۔

"موٹے ـــ موٹے ـــ موٹے۔"

مطلب یہ تھا۔ میں بھوکا ہوں کچھ کھانے کو لا۔

دلیپ نے مسکرا کر طوطے کی طرف دیکھا۔ انگلی کے ایک جھٹکے سے اس طوطے کے پنجرے کو گھما دیا اور خود وہاں سے چل دیا۔ طوطے نے طنز آمیز لہجہ میں بار بار چلا کر کہا۔

"موٹے ـــ موٹے ـــ موٹے۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

مشرق کی طرف مڑ کر دلیپ چلتے ہوئے برآمدے کے نکڑ پر پہونچا۔ یہاں جنیا بائی سبزی کا بڑا ٹوکرا رکھے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اطمینان سے اس لئے کہ سب سے زیادہ گاہک اس کے پاس آتے تھے۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ مگر خدوخال تیکھے تھے۔ اور نگاہیں کیٹیلی پچاس ساٹھ برس کے سن رسیدہ لوگ اکثر اسی سے بھاجی خریدتے تھے۔ جنیا بائی آنکھوں میں بہت کاجل لگاتی تھی۔ اس لئے دلیپ اسے کاجل والی کہتا تھا۔

"کاجل والی۔" دلیپ اس کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔ "چار مرچ اور

ایک امرود۔"

دلیپ کی ران کا ایک حصہ کاجل والی کی ساڑھی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔
کاجل والی نے دھیرے سے اپنے بدن کے بوجھ کا ایک حصہ دلیپ کی ران پر لاد دیا اور
چار مرچ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"بارہ آنے ہو گئے — دلیپے۔"

"کوئی بات نہیں کاجل والی۔ اکٹھا چکا دوں گا۔ ایک دن تجھے سینما
لے جاؤں گا۔"

"آں — ہاں۔" کاجل والی بے اعتباری سے بولی۔ "دو مہینے سے کہہ
رہے ہو۔"

"سچ۔" دلیپ نے امرود اور مرچ لے کر اپنی ٹانگ پر سے سرکا لی۔
"کیشو کہتا تھا۔ اس کی پکچر کا پریمیر ہونے والا ہے مجھے دو ٹکٹ دیگا۔"
"سن"۔ کاجل والی نے اسے کچھ کہنا چاہا۔ مگر دلیپ پلٹ گیا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖

راستہ ہی اس نے جمشید ایرانی والے کی دوکان کی کونٹر سے ......
کچھ کہے سنے بغیر چار بڑی بڑی ڈبل روٹیاں اٹھالیں اور مکھن کی ایک ٹکیا۔ جب
چلنے لگا تو ایرانی نے کہا۔

"پیسے۔؟"

"دست ۔!" دلیپ نے اسے جواب دیا۔ اور چلا گیا۔ ایرانی سہم کر رہ گیا۔ چار دوکانیں چھوڑ کر وہ نور ریستوران کے باہر رکا۔ منشی کبابیا اس ریستوران کے کباب کارنر میں سیخ کباب تیار کر رہا تھا۔ دلیپ کو دیکھ کر اس کے گنگنانے کی آواز ایک دم تھم گئی۔

دلیپ بولا۔ "چھ سیخ کباب۔"

"پیسے۔؟" منشی نے پھنسے ہوئے گلے سے کہا۔

"ہشت۔" دلیپ گہری آواز میں غرایا۔

منشی کا سارا جسم ساکت ہو گیا۔ ہاتھ سیخوں کی طرف بڑھتے ہی نہیں تھے۔ دلیپ نے انگاروں پر تیار کی ہوئی چھ سیخیں باری باری اٹھا لیں اور انہیں ایک دوہرے کاغذ میں لپیٹ کر رکھتا گیا۔ پھر سیٹی بجاتے ہوئے آگے روانہ ہو گیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

جب بازار کے لڑکوں نے دلیپ کو ڈبل روٹیوں سے لدا پھندا آتے دیکھا تو اس کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ یہ بچے اسی لکڑی کے کاڑ بڈ میں رات کو سوتے تھے۔ اور دن کو گداگری کرتے تھے۔ بہت دور سے آئے تھے۔ یہ بچے دھمن گاؤں سے اور بیڑ گاؤں سے بہرا سیا اور چوپنیا سے۔ دیہات میں سوکھا پڑا تھا۔ کچھ لوگ سڑک کے بننے پر لگ گئے، کچھ لوگ شہر چلے آئے۔ ان بچوں کے ساتھ ان کے ماں، باپ، بھائی، بہن بھی تھے۔ وہ سب صبح ہی صبح کام کی تلاش

میں نکل جاتے تھے۔ بچوں کا ناشتہ دلیپ کے ساتھ ہوتا تھا۔

دلیپ نے ایک ایک ڈبل روٹی کے تین تین حصے کئے اور انہیں کباب کے ٹکڑوں کے ساتھ سب میں بانٹ دیا۔ آدھی ڈبل روٹی اور تھوڑا سا مکھن اور ایک کباب اپنے لئے رکھ لیا۔

لڑکے جو شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد اکٹھے ہوئے تھے اب اپنا اپنا حصہ لے کر جا چکے تھے۔ دلیپ اپنے حصے کی ڈبل روٹی پر مکھن لگا کر بیچ کے نرم حصے میں کباب دبا کر کھانے لگا۔

یکایک طوطا زور سے چلایا۔

"موٹے ــــ موٹے ــــ موٹے۔"

دلیپ نے ایک مرچ طوطے کی چونچ میں دیدی پھر مڑکر بازار کا تماشہ دیکھنے لگا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

بالکل سامنے راشن کی دوکان سے ایک بڈھا راشن کا بھرا تھیلا اپنے ہاتھ میں لئے چھتری کے سہارے دھیرے دھیرے اتر کر فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ جب وہ کوئی دس قدم آگے چلا ہوگا۔ تو یکایک کسی نے اسے ٹھوکا دیا اور وہ زمین پہ گر پڑا۔ دوسرے نے اس کا تھیلا چھیننے کی کوشش کی۔ تیسرے نے اس کی چھتری اٹھالی مگر بڈھے نے راشن کا تھیلا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تین چار نوجوان چھو کرے اس پر پل پڑے۔

دلیپ کا جبڑا زور زور سے چلنے لگا۔ یکایک اس نے لڑکی کے چھپتے ہوئے برآمدے کے جنگلے سے چھلانگ لگائی اور دو تین جستوں میں ان کے پاس جا رہا۔ ایک چھوکرے کو اس نے گھونسا دیا۔ دوسرے کو پیٹ میں لات لگائی۔ تیسرے کو اڑنگی مار کر گرا دیا۔ نوجوان چھوکرے اسے دیکھ کر تتر بتر ہو گئے۔

دلیپ نے بڈھے کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اس کے کپڑے جھاڑے اس کے تھیلے میں سے کچھ سامان جو باہر گر گیا تھا۔ واپس اسی جھولے میں ڈالا اور بڈھے سے بولا۔

"کاکا۔ اب جلدی نکلو یہاں سے۔"

بڈھے نے زیر لب اس کا شکریہ ادا کیا اور جھولا سنبھالتے ہوئے حیرت انگیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی چھ سات لڑکوں کا غول دلیپ پر پل پڑا۔ یہ سب چھوکرے نوجوان چست اور چالاک تھے مگر دلیپ کے مقابلے میں ناتجربہ کار تھے۔ پھر بھی جم کر لڑائی شروع ہو گئی۔ دلیپ عرصے سے ان نوجوان غنڈوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ جب تک وہ اس بازار سے دلیپ کو نکال نہیں دینگے۔ اس بازار پر ان کا راج ناممکن تھا۔ اس لئے وہ بڑی ہی واری سے لڑتے جا رہے تھے۔

ادھر دلیپ بھی بڑی مشاقی اور بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ یہی بازار تو اس کا تھا۔ اس کی مملکت۔ اس کا گھر۔ اسی میں اس کا بچپن اس کا لڑکپن اور اب اس کی جوانی گزر رہی تھی۔ وہ کوئی اور جگہ نہیں جانتا تھا۔ یہی اس کا دیس تھا۔

ملک، قوم، مذہب۔ اس کی زبان پر گالیوں کی جدت سنتی اور بھینچی ہوئی مٹھیوں میں طاقتور گھونسوں کی شدت۔

اتنے میں ایک کالی گاڑی فٹ پاتھ سے لگ کر لڑائی سے چند گز کے فاصلے پر رک کر کھڑی ہوگئی۔ ڈرائیور نے مڑ کر پیچھے بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے آدمی سے کچھ کہا جو ایک موٹا سگار پی رہا تھا۔ اس آدمی نے زیر لب اپنے ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے چابی گھما کر انجن کٹ کر دیا۔ اور اطمینان سے مالک کی طرح لڑائی کے آثار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔

دلیپ اکیلا پانچ، چھ چھوکروں سے لڑ رہا تھا۔ دو نوجوان کو تو اس نے پچھاڑ دیا تھا۔ مگر ان کی جگہ لینے کے لئے دو تین غنڈے اور آ رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر کا آدمی اطمینان سے سگار پیتا رہا اور لڑائی کا منظر دیکھتا رہا۔

یکایک پولیس کا سائرن بجا اور قریب آتا ہوا معلوم ہوا۔ سائرن کی آواز دھیرے دھیرے تیز ہوتی گئی۔ چند لمحوں کے بعد نوجوان چھوکروں کے کان میں بھی اس کی آواز آنے لگی۔ اور وہ اکدم لڑائی چھوڑ کر قریب کی گلیوں میں تتر بتر ہو گئے۔

اب لڑائی کرنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ دلیپ کا ایک ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس سے خون بہہ رہا تھا۔ نیچے بازار کے فرش پر دو چھوکرے اس کے قدموں میں بچھے ہوئے تھے۔ دلیپ نے ان کی طرف ہانپ کر دیکھا۔ لڑتے لڑتے وہ بھی تھک گیا تھا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے لہو پونچھا۔ ایک سرخ لکیر اس کی تولیہ نما پر دار

چھینٹی شرٹ پر سے گزرتی ہوئی اس کی میلی چیکیٹ پتلون پر دھاری بناتی گزر گئی۔

پولیس کی ویگن قریب آکر زور سے رُکی۔ ڈرائیور نے اسے پریشان کرنے کے لئے کس غضب کا بریک مارا تھا۔ بس چند انچ پہلے ویگن رکی۔ ورنہ اس کے سر سے گزر جاتی۔ مگر دلیپ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

اس نے چور نگاہوں سے ویگن سے اترتے پولیس انسپکٹر کو دیکھ لیا۔ انسپکٹر نے سنتریوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے دونوں بیہوش چھوکرے اٹھا کر ویگن میں لا دے۔ پھر انسپکٹر نے گردن کے خم سے اشارہ کیا، دلیپ کی طرف جیسے کہہ رہا ہو۔ " ویگن میں بیٹھو۔ "

دلیپ کچھ کہے سنے بغیر پولیس کی ویگن میں بیٹھ گیا۔

پولیس ویگن چلی گئی۔

ٹیلی فون کے تار پر بیٹھا ہوا ایک کوّا زور سے چلایا۔ لڑائی ختم ہوتے ہی بند ہوتی ہوئی دوکانوں کے پٹ کھل گئے۔ بازار کا ریلا بڑھ گیا۔ رکی ہوئی موٹروں کے ہارن زور زور سے بجنے لگے۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنے موٹے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

" کوتوالی چلو۔ "

تھانیدار گیندا رام کوتوالی کے حبس کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کی میلی چوڑی میز کے اس پار کھڑکی اور دروازے سے وہ باہر برآمدے میں کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ برآمدے سے نیچے اتر کر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جو مسلسل نا قدری سے جھاڑ جھنکاڑ میں بدل چکا تھا۔ کوتوالی کی دیوار پر بوگن ویلیا کی بیل پر چند کمھلائے پھول خوفزدہ ملزموں کی طرح سر جھکائے نظر آتے تھے۔ دیوار کے پار سڑک تھی، اور سڑک کے پار بچوں کا پارک، کچھ بھی تو نہیں ہے۔ کہیں پر کوئی امید نہیں ہے۔ لڑکی کا رشتہ تو اچھے گھر میں کر چکا ہوں لیکن جہیز کے بیس ہزار کہاں سے لاؤں گا۔ لڑائی دنگے، چاقو بازی کے بہت سے کیس آرہے ہیں لیکن دونوں فریقین بھوکے ننگے۔ تلاشی لو، تو کسی کی جیب سے دس آنے کسی کی جیب سے ایک سڑی ہوئی بیڑیوں کا پیکٹ۔ جو موٹا قتل کیس ہوتا ہے تو اُسے

خود سپرنٹنڈنٹ بہادر سنبھال لیتے ہیں۔ بیس ہزار کیا بیس سو ابھی تک پورے نہیں ہوئے اور جو مہنگائی کا عالم ہے اس میں دیانت دار سے دیانت دار انسپکٹر بھی دو دن سے زیادہ اپنا ایمان قایم نہیں رکھ سکتا۔ کرپشن کی بات کرتے ہو۔ میاں کرپشن نہ ہو تو یہ زندگی ایک دن نہ چلے۔ اس سوسائٹی کے بس میں دوسرے دن آگ لگ جائے۔ میں سوشلزم کے حق میں ہوں مگر کرپشن کے ساتھ بھگوان کے لئے کچھ تو سوچو۔ خالی خولی سوشلزم کے ساتھ کیا بیس ہزار کا جہیز دیا جا سکتا ہے۔ اور داماد سیول انجینئر ہے۔ سولہ سو تنخواہ پاتا ہے۔ یہ داماد ہاتھ سے گیا تو پھر شاید سیما کے لئے ایک کلرک بھی نہ ملے گا۔ آجکل وہ بھی پانچ ہزار سے کم میں نہیں آتا۔ سکوٹر الگ مانگتا ہے۔

حولدار اسحاق اندر آیا۔ گیندارام نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اسحاق بولا۔ "تلاشی لے لی۔ بس یہ ملا۔"

اسحاق نے ایک لائیٹر بھوری میز کے سامنے رکھ دیا۔ بس یہی۔

لائیٹر اسحاق نے دلیپ کی جیب سے برآمد کیا تھا۔

گیندارام کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"حرام زادہ۔"

"سؤر کا بچہ۔" اسحاق بولا۔

"اس کی ماں کو ——"

"بہن کو بھی۔" اسحاق نے لقمہ لگایا۔

چند لمحوں تک دونوں دلیپ کو گالیاں دیتے رہے یعنی اپنی قسمت کو کوستے رہے کیونکہ اگر گینداارام کے چار بچے تھے تو اسحاق کے سات تھے۔ وہ محض حوالدار تھا۔ اس لئے گینداارام سے کہیں زیادہ بدقسمت تھا۔ اگر وہ روز دس بارہ روپے گھر لے کر نہ جائے تو اس کا گھر نہیں چل سکتا۔ اور آج صبح سے صرف ڈیڑھ روپیہ ملا تھا۔

"اس کو اندر بھیجو۔" انسپکٹر نے کہا۔

دلیپ اندر آیا۔ انسپکٹر نے گالیوں کی بوچھار شروع کی۔

دلیپ نے پہلے تو مزے سے لائیٹر اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا پھر دانتوں سے اپنی چھنگلیا کے ناخن کو کاٹنے لگا۔

گینداارام بدستور اسے گالیاں دئیے جا رہا۔ دلیپ نہایت اطمینان سے سن رہا۔ چھنگلیا کے ناخن کو کاٹ کر اس نے ساتھ والی انگلی کا ناخن کاٹنا شروع کیا اور بیچ والی انگلی پر پہونچا تو انسپکٹر کا پارہ نصف النہار پر پہونچ چکا تھا۔

اتنے میں اسحاق نے دروازے سے انسپکٹر کو کچھ اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی گینداارام نے گالیوں کی ایک نئی پھلجھڑی چھوڑتے ہوئے دلیپ سے کہا۔

"باہر نکل جاؤ۔ بدتخم۔!"

جب دلیپ ناخن کترکتا ہوا باہر نکل گیا تو اسحاق اندر آیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے انسپکٹر کی مٹھی میں پچاس روپئے رکھ کے کہا۔ "بھابھکر کے لڑکوں نے دیئے ہیں۔ کہا ہے اس بار تو ضرور دلیپ کو چھ ماہ کے لئے اندر کرا دو۔"

یہ کہ انہی لڑکوں نے اسحاق کو پندرہ روپئے دیئے تھے۔ یہ اسحاق نے گینداارام سے نہیں کہا۔ مگر کیا گینداارام سمجھتا نہیں تھا۔ اس نے پچاس روپے جیب میں رکھے اور اسحاق

سے بولا۔" سب لڑکوں کے بیانات قلمبند کرو۔ بازار کے کچھ دوکانداروں کو پیش کرو۔ ان سے بھی دلیپ کے خلاف بیان لکھواؤ۔ ایک چاقو دلیپ کی جیب سے برآمد کرو۔ رامپوری چاقو سمجھے۔؟"

"سمجھا جناب۔!" اسحاق خوش ہو کر بولا۔

"کہو تو ایک ریوالور برآمد کر دوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ بس رامپوری چاقو کافی ہے۔ پہلی سزا کے لیے دوسری بار جب آئے گا۔ تو ریوالور برآمد کر دینگے۔"

"جو حکم حضور۔" کہہ کر اسحاق جو باہر گیا تو گنیدارام نے دیکھا کہ ایک کالی گاڑی برآمدے کے باہر آ کر رکی ہے اور اس میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، مضبوط، تگڑا، خوش پوش، ایک موٹا سگار پیتے ہوئے برآمدے کے اندر آ رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ اسحاق سے کچھ بات کر رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اسحاق اسے الگ لیجا کر کچھ بات کر رہا ہے۔ گنیدارام کے دل میں امیدیں جاگنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ خوش پوش آدمی دیوار سے لگے دلیپ کے قریب سے گزر کر اسحاق کے ساتھ انسپکٹر کے کمرے میں گھس گیا۔ اسحاق نے اندر جاتے ہی دروازہ بھیڑ دیا۔ انسپکٹر نے خوش پوش آدمی کو تعظیم دی کیونکہ اس کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ جو بار بار حرکت کرنے سے بجلی کی طرح گنیدارام کی آنکھوں میں کوند جاتی تھی۔ اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

خوش پوش آدمی نے جیب سے بٹوا نکالا۔ اس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے۔ انہیں میز کے نیچے سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔" وہ باہر جو لڑکا کھڑا ہے اسے چھوڑ دو۔"

"دلیپ۔!" انسپکٹر نے جلدی سے نوٹ سنبھالتے ہوئے کہا

"کیا اس کا نام دلیپ ہے۔؟"

"ہاں۔! ہاں۔!" اسحاق بولا۔

"مگر وہ تو بڑا خطرناک غنڈہ ہے۔"

"ہاں۔! ہاں۔! وہی۔" خوش پوش آدمی نے بیس کے دو نوٹ اسحاق کو دیتے ہوئے کہا۔

"مگر۔" اسحاق نے آنا کانی کرتے ہوئے کہا۔

"من من مت کرو۔" گنبدارام گرج کر بولا۔ "صاحب جیسے بولتے ہیں ویسے کرو۔" پھر خوش پوش آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کا نام۔؟"

اجنبی نے جیب سے اپنا پاسپورٹ نکالا۔ اپنا کارڈ نکالا۔ دونوں انسپکٹر کے ہاتھ میں دے دیئے۔ انسپکٹر نے دیکھ دا کر کے اطمینان کر لیا۔ حالانکہ اطمینان تو اسے بہت پہلے ہو چکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے صاحب۔!" گنبدارام نے بڑی خوشدلی سے کہا۔

"اسحاق دلیپ کو چھوڑ دو۔"

"اسے میری گاڑی میں بٹھا دو۔" خوش پوش آدمی بولا۔

"اسے صاحب کی گاڑی میں بٹھا دو۔ اور ان بدمعاشوں کو اندر بلاؤ جنہوں نے دلیپ پر بھرے بازار میں حملہ کیا ہے۔"

"بہت اچھا حضور۔!" اسحاق خوش پوش آدمی کو باہر لیجانے لگا۔ یکایک

گیندارام بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تعظیم دیتا ہوا اسے باہر تک لے گیا۔
باہر دلیپ ابھی تک دیوار سے لگا کھڑا تھا۔
اسے دیکھ کر گیندارام رک گیا۔ اور بڑی سختی سے بولا۔ "وہ کون بدمعاش تھے جنہوں نے تم پر حملہ کیا۔؟"
"جی۔؟" دلیپ حیران ہو کر بولا۔
"کیا تم ان لفنگوں کو پہچان سکتے ہو۔ جنہوں نے بھرے بازار میں تم پر چاقو سے حملہ کیا۔؟"
"جی۔ جی۔؟" دلیپ بالکل سکتے میں آگیا۔
خوش پوش آدمی بولا۔ "میری مانو انسپکٹر صاحب، تو اس قصے کو بالکل ہی بھول جاؤ۔ نوجوانوں کا خون گرم رہتا ہے۔ یہ لوگ بہت جلد طیش میں آ جاتے ہیں۔"
"نہیں صاحب۔" گیندارام سر ہلا کر بولا۔ "میں ان بدمعاشوں کو ضرور مزا چکھاؤں گا۔ قانون کی خلاف ورزی جو کرے گا۔ گیندارام اس کا دشمن ہے۔"
"چلو۔ دلیپ میرے ساتھ چلو۔"
"مگر۔" دلیپ نے حیرت سے کہا۔
"اگر مگر کچھ نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔ سب بتاتا ہوں۔" خوش پوش آدمی نے دلیپ سے کہا۔
ڈرائیور نے گاڑی کا پٹ کھول دیا۔ عین اس وقت دلیپ کو کاجل والی نظر آئی جو برآمدے کی ایک سیڑھی پر کھڑی تھی۔
"کیا ہے کاجل والی۔" دلیپ نے اس سے پوچھا۔

وہ بولی۔ "تیری ضمانت دینے آئی تھی۔"

"اس کی اب ضرورت نہیں ہے۔ صاحب نے میری ضمانت دیدی ہے۔"

پھر دلیپ اجنبی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کہاں چلنا ہے اب۔؟"

"تمہارا سامان کدھر ہے۔؟" اجنبی نے پوچھا۔

"تمہیں میرے سامان سے کیا ہے۔؟" دلیپ نے قدرے سخت لہجہ میں کہا۔

"ایسے ہی پوچھتا ہوں مسٹر!" اجنبی نے دلیپ کے شانے پر شفقت بھری تھپکی دی۔

دلیپ کا سارا غصہ جاتا رہا۔ ہنس کر بولا۔ "اپنا سامان ہی کیا ہے۔ کپڑوں کا یہ جوڑا جو میں پہنے ہوں۔ ایک لوٹا جو منشی لال پرچون والے کی دوکان کے سامنے لٹکا ہے اور ایک بستر جو لکڑی کے کھمبے کے نیچے پڑا ہے وہیں پڑا اور کچھ قرض......"

"یہ کون ہے۔؟" اجنبی نے بھاجی والی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہر ساڑی میں بالکل ہری مرچ معلوم ہوتی ہے۔ کاجل بھری آنکھیں کتنی روشن ہیں مگر ہے وہی فٹ پاتھ والی۔ دس بیس میں پٹ جائے گی۔ شائد اس سے کم میں۔ مگر اسے اس سے کم دینا میری شان کے خلاف ہے۔" یونہی سوچتے سوچتے اجنبی اپنی موٹر کی طرف دلیپ کو لیجانے لگا اور بولا۔

"تو چلو۔ اپنا لوٹا اپنے بازار سے لیتے چلو۔"

"لے کر کہاں چلوں۔؟" پھر دلیپ ذرا سا بگڑ کر بولا۔

"میرے گھر۔"

"کیوں۔؟"

"تم چلو تو۔" اجنبی نے ایسے پیار سے کہا کہ دلیپ کو اس کے میٹھے مہربان لہجہ کے سامنے چپ ہو جانا پڑا۔ کسی قدر حیرت سے سر ہلا کر چپ ہو گیا۔ "کاجل والی کو بازار تک چھوڑنے چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اجنبی نے کاجل والی سے کہا "بیٹھو۔"

کاجل والی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔

جب گاڑی پولیس اسٹیشن سے باہر نکلی تو دلیپ کے ساتھ لڑنے والے چھوکرے برآمدے میں کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ کیا۔؟ پچاس روپے گھا دیئے پھر بھی یہ کمبخت چھوٹ گیا۔ کیسی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر جا رہا ہے۔ کس کی گاڑی ہے یہ۔؟

بروکیڈ کے جس صوفے پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے بالمقابل دوسرے صوفے پر دلیپ اپنے پھٹے کپڑوں میں ایک عجیب اضطراب کے عالم میں بیٹھا کبھی کمرے کی منقش چھت کو دیکھتا جس کے وسط میں ہرے اور سفید بلور کا ایک استنبولی فانوس روشن تھا۔ کبھی اسکی نگاہیں کمرے کے قیمتی سازوسامان سے مرعوب ہو جاتیں۔ کبھی وہ اپنے قدموں میں بچھے ہوئے دیوار تا دیوار غالیچے کی دبیز نرمی کو اپنے ننگے پاؤں سے محسوس کرتا۔ یہ کمرہ شہر سے باہر مضافات کے ایک کھلے علاقے کے ایک دو منزلہ اور بے حد آراستہ بنگلے کا ڈرائینگ روم تھا۔ دلیپ نے اپنی زندگی میں آج تک ایسا خوبصورت سجا ہوا آرائشی سازوسامان سے مزین گھر نہیں دیکھا تھا۔ اس بات کی اسے کوئی خوشی نہ تھی۔ اک الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہاں آ کے پھنس گیا۔؟ اور یہ اجنبی کون ہے۔؟ جو اسے اس طرح گہری اپنائیت سے اپنے گھر میں لے آیا ہے۔ وہ ان سب سوالوں کے جواب چاہتا تھا۔ مگر اجنبی اس کی الجھن سے بالکل

لاتعلق صوفے پر بیٹھا سگار پی رہا ہے اور کبھی کبھی مسرور نگاہوں سے دلیپ کی طرف دیکھ لیتا ہے۔

دلیپ نے غور سے اپنے اجنبی محسن کے چہرے کو دیکھا۔ ضرورت سے زیادہ چوڑا چہرہ کسی حد تک بیٹھی ہوئی ناک۔ چوڑے جبڑے، چوڑی پیشانی، مسکراہٹ کے باوجود چہرے پر سختی۔ لانبے لانبے ہاتھ پاؤں۔ ہاتھوں پر بیشمار بال۔ ٹانگوں پر بھی ہونگے۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ بالکل ایسا جیسا کالو سا لگتا تھا۔ جسے اچھے کپڑے پہنا دیئے جائیں ہاں۔ مگر اس کی شخصیت میں رعب کی کیفیت ہے۔ رعب اور غرور اور حاکمانہ رنگ

معلوم نہیں کون ہے۔؟ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

آخر دلیپ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کا نام۔؟"

"جسونت سنگھ۔"

"کیا کرتے ہو۔؟"

"بزنس۔"

"کس طرح کا بزنس۔؟"

"بس ایسا ہی بزنس۔" جسونت سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھئے صاحب۔!" دلیپ بھڑک کر بولا۔ "یہ چار سو بیسی مجھ سے نہیں چلے گی صاف صاف بولو۔ بات کیا ہے۔؟ مجھ کو کیوں یہاں لائے ہو۔؟ کس لئے تم نے میری ضمانت دی۔؟ مجھے پولیس سے چھڑایا۔ جنیا بائی کا جل والی کو پیسے دے کر میرا قرضہ چکایا۔ ایرانی ہوٹل والے کو پیسے دیئے۔ کباب والے کو پیسے دیئے لانڈری والے کو

پیسے دیئے۔ میرا سارا قرضہ چکا دیا۔ آخر پولیس کو بھی کچھ دیا ہوگا۔ کیوں۔؟"

جسونت سنگھ ایک منٹ خاموش رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اس لئے کہ میں تمہارا چچا ہوں۔!"

"کیا۔؟" دلیپ صوفے سے اچھل گیا۔ پھر بیٹھ کر اس نے صوفے کی ہتھی کو زور سے پکڑ لیا۔

جسونت سنگھ نے دو تین مرتبہ اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ہاں میں تمہارا چچا ہوں۔"

مارے غصے کے دلیپ کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ صوفے پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

" دیکھو مسٹر۔ یہ چالبازی مجھ سے نہیں چلے گی۔ میرا کوئی چچا نہیں ہے۔ کوئی باپ نہیں۔ کوئی ماں نہیں۔ جو کچھ ہے وہی گلی ہے جہاں سے تم مجھے اٹھا کے لائے ہو۔ وہی گلی میری ماں۔ میرا باپ۔ میرا چچا۔ میری سب کچھ۔۔۔۔۔۔ میں بجار کا بیٹا ہوں۔ اکرم پن واس۔ سمجھے۔"

جسونت سنگھ نے پھر دوہرایا۔ " میں تمہارا چچا ہوں۔"

دلیپ نے بڑے کڑے لہجہ میں کہا۔" اگر تم میرے چچا ہو تو اب تک کدھر مرے پڑے تھے۔؟ اس وقت تم کو میری یاد نہیں آئی جب میں بالکل چھوٹا تھا۔ اور میری ماں مجھے گود میں اٹھا کر اس شہر کی گلی گلی میں بھیک مانگتی تھی۔ اس وقت تم کو میری یاد نہیں آئی جب چار سال کا تھا۔ اور میری ماں اسی بجار میں مجھ کو اکیلا چھوڑ کر مر گئی۔ اس وقت کہاں تھے تم۔؟"

"میں کینیا میں تھا۔" جسونت سنگھ نے کہا۔

"وہ کون سی جگہ ہے۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

"افریقہ میں ہے۔"

"افریقہ کدھر ہے۔؟"

"یہاں سے بہت دور ہے۔ وہاں میں سولہ سال رہا۔"

"پھر یہاں کیوں آئے۔؟"

"پھر یہ ہوا کہ کینیا میں افریقیوں کی سرکار قائم ہوگئی اور انہوں نے ہم ہندوستانی کے باشندوں کو باہر نکال دیا۔ تو میں ہندوستان آگیا اور یہاں آکر رہ گیا۔ اور یہاں بس کر تمہیں ڈھونڈنے لگا۔ اور تمہاری ماں کو۔ پہلے میں اپنے آبائی گاؤں گیا۔ نور اگاؤں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ تمہاری ماں جب تم چھ مہینے کے تھے تمہیں لے کر شہر آگئی تھی۔ تمہارے باپ کا تو اس وقت انتقال ہوگیا تھا جب تم اپنی ماں کے پیٹ میں بچہ تھے۔!"

"ہاں۔" دلیپ کسی قدر اداسی سے بولا۔ "میں نے اپنے باپ کی کبھی صورت نہیں دیکھی۔ ماں کی صورت کی یاد بھی اب دھندلی سی ہے۔"

"اس شہر میں آکر دو برس سے تمہیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کل ایک سراغ ملا۔ آج تم کو پکڑ لیا۔"

"اس کا کیا ثبوت ہے کہ میں ہی تمہارا بھتیجا ہوں یعنی تم میرے چچا ہو۔؟"

جسونت سنگھ نے بڑے گمبھیر لہجہ میں کہا۔ "تمہاری ماں نے تمہارے گلے میں چاندی کا ایک تعویذ ڈالا تھا۔ اس میں تمہارے باپ کی تصویر ہے۔ کالے ڈورے سے

بندھا ہوا یہ تعویذ میں اس وقت بھی تمہارے گلے میں دیکھ سکتا ہوں۔"

یکایک دلیپ کا ہاتھ اپنے گلے میں پڑے ہوئے تعویذ پر گیا۔

"اگر تم میرے بھتیجے ہو۔" جسونت سنگھ بولا۔" تو اس چاندی کے لاکٹ میں میرے بھائی کلونت سنگھ کی تصویر ہوگی۔"

دلیپ نے دو تین بار اپنے گلے کے لاکٹ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے اتارا اور لاکٹ کھول کر دیکھا۔ واقعی لاکٹ کے اندر ایک تصویر تھی۔ اس کے باپ کی تصویر۔

دلیپ نے سوالیہ نگاہوں سے جسونت سنگھ کی طرف دیکھا۔ جسونت سنگھ نے اس کی بات سمجھ کر اپنی جیب سے پرس نکالا۔ پرس کھول کر اس میں سے ایک تصویر نکالی اور اسے دلیپ کے سامنے رکھ دیا۔

اس تصویر میں دو آدمی رائفلیں لئے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ایک ان میں سے اس کا باپ تھا۔ دوسرا یہی اجنبی جسونت سنگھ۔ چند لمحوں کے لئے در و دیوار دلیپ کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ جیسے زمین اس کے پاؤں سے کھسک گئی ہو جیسے اس کے ذہن میں بہت بڑا بھونچال آیا ہو۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سارا بدن روئی کے گالوں کا بنا ہوا ہے اور ٹانگیں پانی کی طرح بہتی جا رہی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

یکایک وہ جسونت سنگھ کے پاؤں پر گر پڑا۔

جسونت سنگھ نے جلدی سے دلیپ کو اٹھا کر زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

دلیپ سسک سسک کر رونے لگا۔ کتنے سالوں سے وہ رویا نہیں تھا۔

اُسے یاد ہی نہیں تھا۔ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنی کمزوری پر نادم تھا۔ مگر اپنے آنسو روک نہیں سکا جو ابلتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں پہ بہتے جا رہے تھے۔ جانے کتنی پرانی سسکیاں تھیں، جنہوں نے کتنے عرصے سے اس کے سینے میں گھروندا بنا رکھا تھا۔ یکایک حالات کے ایک ہی وار سے گھروندا ٹوٹ گیا اور ایک ایک کرکے زندگی کی ساری سسکیاں اور حسرتیں ہمک کر باہر نکل آئیں۔

ایسے ہی ایک سال نکل گیا۔

چاچا نے کہا تھا۔ مردانہ وصف کے جتنے کھیل ہیں۔ ان میں تمہیں مہارت حاصل کرنی چاہیئے۔ چنانچہ دلیپ نے یہی کیا اور اسے ان کھیلوں میں مہارت حاصل کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ رائفل کا نشانہ تو وہ نوے فیصدی ٹھیک لگا لیتا تھا اور ریوالور چلانے میں اس کا وار کبھی چوکتا نہ تھا۔ اڑتی ہوئی مکھی کو ہوا میں نشانہ بنا لیتا تھا۔ اور دائیں بائیں دونوں ہاتھوں سے ریوالور چلا لیتا تھا۔ جوڈو اور کراٹے کے ایسے ایسے وار اس نے سیکھ لیے کہ شہر کے بڑے بڑے بلیک بلیٹ والے ماہروں کے کان کاٹنے لگا۔ گھوڑ سواری میں وہ طاق ہو گیا۔ چاقو بازی میں وہ مشاق ہو گیا یعنی مردانہ وصف کے جتنے پینترے ہوتے ہیں ان سب پر اسے عبور حاصل ہو گیا۔ سر لڑانے اور گھونسے بازی میں وہ پہلے ہی ہوشیار تھا۔ مگر اب اسے جمناسٹک، پہلوانی اور مکے

بازی کی جو سائنٹفک تربیت ملی تو اس کا فن اور منجھ گیا۔ بدن اور چست اور لچکدار بن گیا۔

پھر اسے شریفوں کے بہت سے چلن سیکھنا پڑے۔ ٹائی اور بو کیسے لگائی جائے۔ چھری کانٹے سے کیسے کھانا کھایا جائے۔ گھوڑ سواری کیسے سلیقے سے ہوتی ہے۔ بال روم ڈانس کیا ہوتا ہے۔ محفل میں بیٹھنے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ مئے سے شغل کرنے کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ ہائی سوسائٹی کی عورتوں سے کیسے بات کی جاتی ہے۔ سگریٹ سلگانے اور بجھانے کی تہذیب کیا ہے۔ یہ سب باتیں اسے سیکھنا پڑیں۔ مگر وہ ان سے بہت الجھتا تھا۔ اور دل ہی دل میں کوستا تھا کہ یہ کیا حماقت ہے۔ ٹائی اور بو اس کے گلے میں پھندے کی طرح پھنسنے لگتے۔ اور پورے آستین کے کف کوٹ سے باہر نکلے ہوتے اور ان پر کف لنکس عجیب سے لگتے جیسے کسی نے اسے پنجرے میں بند کر دیا ہو۔ اپنے استادوں کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو سرکس کا جانور تصور کرنے لگتا۔

سب سے زیادہ مشکل کام اس کے لئے پڑھنا اور لکھنا تھا۔ اسے انگریزی پڑھائی جا رہی تھی۔ اس کے چچا کا بھی یہ اصرار نہ تھا کہ وہ اسے عالم و فاضل بنا دے لیکن "ابتدائی مشقیں تو ضروری ہی تھیں۔ اتنا لکھنا پڑھنا تو سیکھ لو کہ اپنا مطلب ادا کر سکو۔ خصوصاً انگریزی بولنا بہت ضروری ہے۔"

پہلے پہل اس نے انگریزی کی گالیاں سیکھی تھیں اور ان میں خاصی مہارت بہم پہونچائی تھی۔ انہیں گالیوں کے ذریعہ آس پاس کے مصدر اور اسمائے صفت جمع کرتے ہوئے دھیرے دھیرے اس کے استاد نے نیم شریفانہ انگریزی

میں گفتگو کرنا سکھا دیا۔ پھر جب وہ نیم شریفانہ گفتگو سے شریفانہ اور مہذب آداب کی طرف مڑنے لگا تو اس کی دلچسپی کم ہو گئی۔ بہر حال ایک سال کے عرصے میں اتنا ہوا کہ اپنی مرضی سے یا اپنے چچا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ حسب ضرورت جب چاہے ہائی سوسائٹی کی ایک پتلی سی پرت اپنے اوپر چڑھا لیتا تھا۔ گو اسے اندر ہی اندر الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔

تہذیب کے سارے داؤ پیچ سیکھنے کے بعد بھی دل ہی دل میں وہ فٹ پاتھ کا اکھڑ دلیپ ہی رہا۔ نیم وحشی، اکل کھرا، ہائی سوسائٹی کو حقارت سے دیکھنے والا۔ اُسے یہ لوگ بڑے ہی اوچھے، حقیر اور کمزور نظر آتے۔ ایک گھونسے کی مار۔ یہ لوگ اپنی کمزوری جانتے تھے اس لئے اپنے سے غریب لوگوں کو قانون کی بندشوں سے زیر کرتے تھے۔ فٹ پاتھ پر قانون ہی اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اب جب وہ فٹ پاتھ سے اٹھ کر قانون بنانے والوں کی صف میں آیا تھا۔ آ سے یہ لوگ اور بھی کمینے، تنگ نظر اور ظالم معلوم ہونے لگے تھے۔ مگر اس نے اپنے تاثر کو دل ہی دل میں دبا دیا۔ اس نے کبھی اپنے چچا پر ظاہر نہیں کیا۔ لیکن ظاہر وہ اپنے چچا کی سوسائٹی کا ایک فرد تھا۔

اس نے سوسائٹی سے اس لئے بھی مفاہمت کر لی کہ یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ پاؤں کے نیچے غالیچے، سر کے اوپر چھت۔ سونے کے لئے فوم ربر۔ پہننے کے لئے ریشم۔ کھانے کے لئے عمدہ سے عمدہ کھانے۔ سواری کے لئے گھوڑے اور عورتیں۔ گھوڑے تو اسے پسند آئے مگر اس طبقے کی عورتیں اسے پسند نہیں آئیں۔ کچھ عجیب سی چیا لاکی تھی ان کے چہروں پر چیا لاکی اندر عیاری جیسے جال بچھائے بیٹھی ہوں۔ گھات لگائے بیٹھی ہوں۔ کانٹا ڈالے بیٹھی ہوں۔ مکڑیاں۔ کس قدر کمزور تھیں یہاں کی عورتیں۔ کلائی پکڑو تو کلائی چٹخ جائے۔ لب چوم لو

تو ہونٹ سوج جائیں۔ کمر پکڑ کر بھینچ تو تو ایک آدھ پسلی کھسک جائے اور کیسے منمنا کر گفتگو کرتی ہیں۔ لفظوں کو چبا چبا کر۔ ان عورتوں سے وہ کبھی متعفنت نہیں ہوا۔ اسے لانگھ باندھ کر ٹوکری اٹھا کر بھاجی بیچنے والی جنیا بائی پسند تھی۔ کاجل والی جو جھگڑ تو سکتی تھی۔ مردوں سے دو بدو لڑ سکتی تھی اور آمنے سامنے گالی دے سکتی تھی۔ کیا بھرپور گالیاں ہوتی تھیں کاجل والی کی۔ ہائی سوسائٹی کی عورت کے ہزار نخرے قربان اس ایک گالی پر۔ لگتا تھا جیسے کسی نے پورا گھونسا گال پر مارا ہے۔ یہ آدھ بھرنے والی سسکیوں پر پلنے والی عورتیں کھلی محبت اور نفرت کی حدت اور شدت کیا جانیں۔

ویسے اس نے آج تک کسی عورت سے پیار نہیں کیا تھا۔ کاجل والی کی طرف دیکھتا ضرور تھا۔ مگر پیار اسے کاجل والی سے بھی نہیں تھا۔ عورت کو دیکھ کر کبھی کبھی وہ خائف سا ہو جاتا۔ کبھی اس کے لئے حقارت سی محسوس کرتا اور کبھی عجیب سی اجنبیت اسی لئے وہ آج تک کسی عورت کے قریب نہیں گیا۔ قریب جاتے جاتے پلٹ جاتا تھا۔ جب تک وہ فٹ پاتھ پر تھا۔ اس کے دوست کئی بار اصرار کر کے اسے طوائفوں کے بازار میں لے گئے۔ کبھی تو اس نے کسی مکان میں جانے سے انکار کر دیا۔ کبھی آدھے راستے سے ہی پلٹ آیا۔ کبھی وہاں پہونچ کر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ ایک عجیب سی روک اس نے ہمیشہ اپنے دل میں محسوس کی۔

اس دوسری دنیا میں آنے کے بعد بھی وہ جھجکتا ہی رہا۔ اگر کسی لڑکی نے اسے اپنے لب پیش کئے تو بھی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کر لیا ہو۔ کسی نے اگر اس کے سینے سے لگ کر لمبے لمبے سانس لئے تو اسے ایسا لگا جیسے وہ دمے میں مبتلا ہو۔ کسی نے اگر اس کے گلے کو ذرا سا گدگدا کر کے چھوڑ دیا تو اسے یہی محسوس

ہوا کہ جیسے کسی مچھر نے اسے کاٹا ہے۔

ایسے لمحوں میں اس کا دھیان کاجل والی کی طرف جاتا تھا۔ اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ تیاگ کر کاجل والی کے پاس چلا جائے اور اسے پکڑ کر اس کا انگ انگ توڑ دے۔ اسے کچر کچر کھا ڈالے یا اسے ثابت و سالم ایک پائی تھان کی طرح نگل جائے۔ کاجل والی کے لئے وہ ایک عجیب قسم کی بہیمیت محسوس کرتا تھا۔ شاید یہی بہیمیت محبت ہوتی ہوگی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا۔

مگر اس سلسلے میں اس نے اپنے چچا سے کبھی مشورہ نہیں کیا۔ اس کا چچا کبھی عورتوں کے موضوع پر اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ نہ عورتوں کے سلسلے میں اس کی خاص حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ دلیپ نے دیکھا کہ چچا جسونت سنگھ خود بھی عورتوں سے دور ہی رہتا ہے۔ چچا نے اس کی گھوڑ سواری میں، موٹر چلانے کی مہارت میں۔ اور مختلف اسلحہ جات کو استعمال کرنے کی تربیت میں بے حد دلچسپی لی تھی۔ مگر عورتوں کے سلسلے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس کا چچا اکثر دورے پر رہتا تھا۔ مہینے میں پندرہ بیس دن شہر سے باہر نکل جاتا۔ کہاں جاتا تھا۔ یہ اس نے اپنے بھتیجے کو کبھی نہیں بتایا نہ اس کے بھتیجے نے کسی طرح کا تجسس ظاہر کیا تھا۔ اسے اپنا گھوڑا ٹوٹی بہت پسند تھا۔ وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر گھنٹوں گھوڑ سواری کے لئے شہر سے باہر نکل جاتا۔ گھوڑے کے ساتھ وہ خود بھی اپنے آپ کو گھوڑا سا محسوس کرتا۔ جیسے دو گھوڑے ایک دوسرے کے تعاقب میں کسی تیز دوڑ میں مصروف ہوں۔ اسے اپنی شمشیر زنی بے حد پسند تھی اور وہ اپنے استاد مجید سے گھنٹوں شمشیر زنی کے کرتب سیکھتا رہتا تھا ـــــــ یا اسے چرن رائفل چلانے، ریوالور اور پستول

کانٹا ٹھیک بلز آئی (Bull's eye) پر لگانے کی کوشش کرتا اور اکثر کامیاب رہتا۔ یہی اس کے مشاغل تھے۔ عورتوں کو قریب قریب وہ لطیفیں سمجھتا تھا۔ چارہ ڈال دیا۔ ذرا سے پر سہلا دیئے اور آگے ڈھکیل دیا۔ بس اتراتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

عورتوں کا بدل اس نے مردانہ کھیلوں اور سپر ہسکی میں ڈھونڈ لیا تھا۔ وہسکی اسے دھیرے دھیرے پسند آنے لگی تھی۔ اور اس کے مزاج پر چھانے لگی تھی۔ فٹ پاتھ پر اسے ہفتہ عشرے میں غسل کا موقع ملتا۔ یہاں آکر اسے شاور کا مزا آنے لگا۔ اور شاور کے بعد صابن اور ٹلکم کی بھینی بھینی خوشبو اور دھلے دھلائے کاٹن کے ملبوس کی مہک اور اشتہا چمک جانے کے بعد پوچڈ انڈے اور سکنے ہوئے تیتر کا ناشتہ۔ گرین ٹی کا لطیف ذائقہ۔ ہاں اس زندگی کی کچھ چیزیں اسے بھا گئی تھیں۔ جب قدِ آدم مؤدب کھڑے ہوں اور گلدان میں پھول جھکے ہوں اور چاندی کی کٹوری میں برف کی ٹکڑیوں پر مکھن کی ٹکڑیاں جولیب رول پر اترنے کے لئے بیتاب ہوں۔ تو اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کہ ایک عجیب سی لذت آمیز کیفیت اس کے پورے وجود کو جھنجھوڑ ڈالے۔

لیکن کبھی کبھی وہ اس زندگی سے اوب جاتا۔ اس پنجرے کی تیلیاں توڑ کر فرار ہو جانے کی سوچتا۔ محمود کے غلام ایاز کی طرح اس نے وارڈروب کے ایک کونے میں اپنی پیوند لگی پتلون اور پھٹی تولیہ نما پرانی پروانی شرٹ سنبھال کر رکھی تھی۔ ایک دن اس بھاگ جانے کی خواہش نے اس قدر پریشان کیا کہ اس نے اپنے نئے کپڑے اتارے اور پرانے کپڑے پہن کر اپنے پرانے بازار چلا گیا جو اس کا وطن تھا۔

بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ شاید اس کی چچا سے لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے واپس آ گیا ہے۔ دوکاندار اور دوسری گینگ کے نخشے اس کے واپس

آجانے سے خوفزدہ بھی ہوئے پھر جلد ہی مطمئن ہو گئے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ وہ صرف ایک رات کے لئے اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے آیا ہے۔ تب تو محبت سے لوگوں نے اس کا سواگت کیا۔ حتیٰ کہ دوسری گینگ کے لوگ بھی اس سے ملنے کے لئے آگئے اور بڑی ہی فراخدالی سے اس سے ملتے رہے۔ وہ ہر ایک دوکاندار کے پاس گیا جن سے وہ روٹی، مکھن کباب، سالن، بلیڈ، صابن، کپڑا قرض لیا تھا۔ دھولس جما کر لیتا تھا۔ اب اس نے سب کا قرض چکا دیا تھا۔ اس لئے وہ سب لوگ بھی اس سے انتہائی خوش دلی سے ملے کچھ لوگوں کے ساتھ اس نے کیرم کھیلا۔ کچھ کے ساتھ تاش....... رات گئے تک مختلف ٹولیوں میں جاتا رہا اور تجدید تعلقات کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ نکڑ کے قریب چلا گیا۔

یہاں دھول فروٹ والے کی دوکان بند تھی۔ اور دیوار اور دوکان کے گہرے کوب میں جینا بائی کاجل والی اپنی سبزی کا ٹوکرا ڈھلیے نیم دراز تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی لانبی پلکوں کی صف کے پیچھے سیاہ بڑی بڑی پتلیاں کسی اندرونی روشنی سے تھرتھرائیں۔ پھر اکدم وہ روشنی بجھ گئی۔ اب اس کا چہرہ ایک نقاب تھا۔ جینا بائی مرد کی بیوفائی سے آگاہ تھی۔ اس کے شوہر نے اسے چھوڑ کر دوسری شادی کر لی تھی۔ اور شعلہ صفت جینا بائی اس حرکت کو برداشت نہیں کر سکی تھی۔ وہ اپنے گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اور اس شہر میں آکر اس بازار کے نکڑ کے قریب بھاجی بیچنے کا دھندا اس نے شروع کر دیا تھا۔ کسی زمانے میں اس نے دلیپ سے لو لگائی تھی۔ مگر دلیپ کے چلے جانے کے بعد وہ شمع بجھ گئی تھی کبھی کبھی جینا بائی سوچتی کہ کدو، لوکی، بینگن اور کریلے کے سہارے زندگی کیسے بتائی جا سکتی ہے مگر اس کے لئے اس بازار کے سوا کہیں عافیت نہ تھی اور کیونکہ وہ جسم کی تگڑی تھی اور زبان دراز تھی اس لئے کسی کو

اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

دلیپ اس کے لئے ٹھرّے کی ایک بوتل لایا تھا۔ اور تلی ہوئی مچھلی۔ دیر تک وہ دونوں کلٹر آمنے سامنے رکھے ٹھرا پیتے رہے اور مچھلی کھاتے رہے۔ دھیرے دھیرے کاجل والی کی آنکھیں نشیلی ہوتی گئیں اور لہجہ شرابی۔ عین مستی کے عالم میں کاجل والی نے دلیپ کا ہاتھ زور سے پکڑ کر کہا۔

"چھ مہینے کے بعد تم آئے ہو سور کے بچے۔"

"ہاں۔"

"کیوں۔؟"

"تیری یاد آگئی۔ فٹ پاتھ پہ تیرے قریب لیٹنا یاد آگیا۔"

"میری یاد آئی۔؟"

"اری حرامزادی جو ایک بار تیری کٹیلی نگاہوں کا شکار ہو گیا وہ تجھے کیسے بھول سکتا ہے"

"مسک لگتا ہے ماور ـــ" وہ بے نقط سنانے لگی۔ چھ ماہ کی غیر حاضری کا ملال اور غصہ بے قابو ہونے لگا تھا۔ اندر ہی اندر وہ کھول رہی تھی۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی گرفت دلیپ کی کلائی پر مضبوط ہوتی گئی۔

"چھوڑ دے مجھے سالزادی۔"

"نہیں چھوڑوں گی۔ زندگی بھر نہیں چھوڑوں گی۔ خبیث۔"

"سالی کمینی۔ کتیا۔"

بینا بائی نے سماجی کے ٹوکرے سے ایک کدو اٹھا کر اسے دلیپ کے

سر پہ مار مار کر ٹکڑے کر دیا۔ اندر سے گدر وا گودا اور رلیشے دلیپ کے چہرے پر سرخ داغ کی طرح پھیل گئے۔ یکایک دلیپ کو ہنسی آ گئی۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے جنیا بائی کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا۔

منہ تو چوم لیا مگر عجیب سی بوئیں اس کے نتھنوں میں بکھر گئیں۔ طرح طرح کی سھاجیوں کی بو۔ بینگن کی بو۔ پالک کی بو۔ کریلے کی بو۔ میل، محنت، پسینے کی بدبو۔

یکایک دلیپ نے جنیا بائی کو چھوڑ دیا۔ وہ سسکتی ہوئی فروٹ اسٹال کی لکڑی کی دیوار سے ٹکرائی اور حیرت سے دلیپ کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ کیا ہوا۔ ایسی گرم جوشی سے اس نے لپٹایا تھا۔ اور اتنی سرد مہری سے اسے چھوڑ دیا۔ ایک ہی لمحہ میں اتنی قربت پھر اتنی دوری۔

جلدی سے دلیپ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ جنیا بائی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کہاں جا رہے ہو۔؟ کہاں جا رہے ہو۔؟ رکو......"

مگر دلیپ رکا نہیں۔ تیز تیز قدموں سے ڈگ بھرتا ہوا بازار سے باہر نکل گیا اسی بازار کی موریوں میں وہ پلا تھا۔ اسی بازار کی بدبوؤں میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ اسی بازار کی غلیظ فضا میں اس کی جوانی نے سانس لیا تھا۔ مگر آج یہی بوئیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ صابن کی ایک چھوٹی سی ٹکیہ نے اس کے سارے جذبے بدل ڈالے ہیں۔

اس بار اس کا چچا تقریباً ڈیڑھ ماہ گھر سے باہر رہا۔ جب واپس آیا تو بے حد تھکا ماندہ معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے دور دراز کے کسی کٹھن سفر سے واپس آ رہا ہو۔

واپس آ کر جسونت سنگھ نے دو دن آرام کیا۔ تیسرے دن جب سفر کی کسلمندی دور ہو گئی تو اس نے اپنے بھتیجے دلیپ کو رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔

دلیپ جب اپنے چچا کی خواب گاہ میں پہنچا تو نوکر اس وقت کافی لا کر رکھ گیا۔ جسونت سنگھ نے کافی بنائی۔ ایک پیالہ دلیپ کو دیا۔ دوسرا خود لیا۔ پھر ایک سگار سلگا کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی نظریں دلیپ پر گڑی تھیں اور چہرہ کسی خفتہ کامرانی سے سرشار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا چچا آج اسے کوئی اہم بات بتانے والا ہے۔ ورنہ وہ دلیپ کے اندر آتے ہی دروازے کی چٹخنی نہ چڑھا دیتا۔

اس کا اندازہ صحیح نکلا۔

جسونت سنگھ نے اپنے سر کے کھچڑی بالوں میں اپنی لانبی انگلیاں پھیریں۔ سگار کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھت کی طرف بکھیرا۔ پھر دلیپ کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

"آج تمہیں اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز بتانا چاہتا ہوں۔"

چچا اس کی طرف دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے چپ رہا۔ دلیپ بھی چپ رہا۔

چچا نے سگار کی راکھ انگلی کے سہارے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے دو سو میل دور سہیل گڑھ کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اب تو نہ وہ ریاست ہے نہ اس کا نواب۔ آخری نواب پرویز اختر بے حد رنگیلا اور نمر چھبیلا تھا۔ اس کا اصطبل اور حرم دونوں ہی گھوڑوں اور عورتوں سے بھرے پڑے تھے۔ اور وہ ان پر بے تحاشہ روپیہ صرف کرتا تھا۔ ریس کے علاوہ اسے جوئے کا بھی شوق تھا۔ اور وہ ہر سال بڑی باقاعدگی سے لاس ویگاس میں جوا کھیلنے جاتا تھا۔ اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ہار جاتا تھا۔ اتنا روپیہ اس کے پاس کہاں سے آتا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں کیونکہ سہیل گڑھ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ گودھرا پہاڑوں کے دامن میں مشکل سے گیارہ بارہ لاکھ کی ریاست ہوگی۔ جب کہ اس کا نواب سال میں اس سے چوگنی رقم اپنے شوق اور اپنی عیاشی پر خرچ کر دیتا تھا۔ یہ رقم کہاں سے آتی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ ریاستوں کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کی رنگینیوں اور عیاشیوں کا وہی سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ زیادہ عمر ہو جانے سے یہ شوق اور بھی زیادہ ہوتا گیا۔ بس اسے قلق تھا تو ایک ہی۔ بیگمات سے اس کے سات آٹھ بچے ہوئے مگر سب کے سب کم سنی میں ہی مر گئے۔

پھر جب اس کی موت کا دن آیا تو اس نے ہمیں بلا بھیجا یعنی مجھے اور میرے بھائی کلونت سنگھ کو کیونکہ ہم نے نواب کی خدمت برس ہا برس بڑی جانفشانی سے کی تھی۔ اور کئی بار اسے اس کے رشتہ داروں کی سازشوں سے بچایا تھا۔ جن سے اس کی جان کا خطرہ تھا۔

جب میں اور کلونت اس کی خوابگاہ میں حاضر کئے گئے تو اندر جانے سے پہلے ڈاکٹروں نے ہمیں بتایا کہ نواب بس کوئی دم کا مہمان ہے۔ اس لئے ہم زیادہ گفتگو نہ کریں۔

مگر خود نواب نے ہمیں زیادہ گفتگو کا موقع نہیں دیا۔ اس کے سانولے گال اور پتک گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد لکیروں کا جال گہرا ہو چلا تھا۔ ہونٹ سیاہی مائل اور سانس کی آمد و رفت میں وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

ہم سے پہلے پانچ آدمی اور اس کے پلنگ کے گرد جمع تھے۔ جب ہم دونوں بھائی بھی آ گئے تو نواب پر دفعتہ اختر کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی اور اس نے نرسوں سے کہا کہ وہ اسے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دیں۔ جب نرسوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ ڈاکٹروں نے منع کیا ہے۔ تو وہ بولا۔ بیٹھنے سے میری سانس کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ اور مجھے ان لوگوں سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ لہٰذا مجھے جلد سہارا دے کر پلنگ پر تکیوں کے سہارے بٹھا دیا جائے۔

آخر ایسا ہی کیا گیا۔ پھر اس کے اشاروں پر دونوں نرسیں بھی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پھر نواب نے ہم میں سے ایک کو خوابگاہ کا دروازہ بند کرنے کو کہا۔ اور جب دروازہ بند ہو گیا تو بولا۔

میرے پاس زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ نہ ہی تمہارے پاس زیادہ ہیلا ہی جتانے کا وقت ہے۔ غور سے سنو۔ میں مر رہا ہوں۔ میرا کوئی بچہ بالا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ میں مرتے وقت جتنا قرضہ چھوڑ رہا ہوں۔ اس لیے جو جائیداد بچی ہے وہ میرے بھانجے بھتیجوں کے کسی کام کی نہیں۔ اس بات کی بھی مجھے خوشی ہے۔

لیکن میں نے تمہیں یہاں آج اس وقت اپنے خاندانی جھگڑے نپٹانے کیلئے نہیں بلایا ہے۔ تم ساتوں نے میری بے حد خدمت کی ہے۔ جانفشانی سے وفاداری سے۔ سچی ایمانداری سے۔ کئی بار تمہاری مدد سے میں کئی مصیبتوں سے بچ نکلا ہوں۔ کئی بار تم لوگوں کی وجہ سے میری جان بچ گئی ہے۔ آج میں تمہیں اس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔

ریاست ختم ہو جانے کے بعد بھی میرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا رہا۔ خاندانی اثاثہ بھی کوئی اتنا نہ تھا کہ میری عیاشیوں کا متحمل ہو سکتا۔ کیونکہ مجھ سے پہلے جو میری ریاست کے وارث تھے وہ کچھ کم عیاش نہیں تھے۔

آج میں تمہیں اپنی بے اندازہ دولت لٹانے کا راز بتاتا ہوں ـــــ ایک بار پہاڑیوں میں شکار کھیلتے ہوئے میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور بھٹکتے بھٹکتے سولہ سترہ ہزار فٹ اونچے پہاڑی سلسلہ سے گزرتے ہوئے ایک برف پوش وادی میں جا نکلا یہ ایک چھوٹی سی بے برگ و گیاہ وادی تھی جہاں برف اور چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک جگہ ایسی نظر آئی جہاں گرم پانی کے چشمے اُبلتے تھے۔ اس چشمے کے چاروں طرف چٹانوں میں میں نے کچے سونے کی دھاریں دیکھیں اور جگہ جگہ کوارٹز کے پتھروں کے ساتھ ناشپاتی کے حجم کے برابر سونے کے ٹکڑے۔ لگتا تھا کہ اس برف کی وادی میں آج تک کسی انسان کے قدم نہیں پہونچے ہیں۔ اور یہاں تک پہونچنا محال بھی تھا۔ بہر حال میں نے کچے سونے کے

کچھ پتھر جمع کر کے اپنی جیبوں میں بھر لئے اور جان پہ کھیل کر کسی نہ کسی طرح اس وادی سے باہر نکل کر اس برف پوش پہاڑی سلسلہ سے باہر آنے میں کامیاب ہو گیا اور سہیل گڑھ واپس آ گیا۔

واپس آ کر میں نے یہ پتھر شاہی سُنار کے حوالے کئے۔ اس نے انہیں گلا کر ان میں سے جو دھات نکالی وہ خالص سونا تھی۔ میں تمہیں بتا ہی نہیں سکتا اس امر سے مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ اب سونے کی ایک ایسی کان میرے پاس تھی۔ جس کے گرد و پیش سے صرف میں واقف تھا۔ جس کا صرف میں مالک تھا۔ اور جس کا راز میرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

چنانچہ جب میرے پاس روپیہ ختم ہو جاتا۔ میں سیدھا اس کان کا رُخ کرتا اور سونا بھر کر لے آتا۔ میری نوابی ختم ہو گئی۔ راجگی۔ جاگیرداری۔ زمینداری تباہ ہو گئی لیکن اس کان کے سہارے میرے سارے شوق جاری رہے بلکہ "بڑھ گئے"۔

اب میرا آخری دم آن پہونچا ہے۔ اس لئے میں یہ کان تم ساتوں کو سونپتا ہوں کسی ایک اکیلے کو نہیں۔ یہ بے انصافی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں تم ساتوں اس کان کے حصہ دار بن جاؤ۔ اس کان کا نقشہ میرے پاس موجود ہے۔ اور میرے سوا دنیا میں اور کسی کے پاس اس کان کا نقشہ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر نواب نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے سرہانے سے ایک چیز نکالی۔ یہ سونے کا ایک چھوٹا سا توا تھا جس پر مختلف مقامات کے نشان بنے ہوئے تھے۔ اور سونے میں حروف کھدے ہوئے تھے۔

اپنے لرزتے ہاتھوں میں وہ توا انہیں دکھا کر بولا۔ یہ وہ نقشہ ہے جس پر کان

کو جانے کا راستہ کھلا ہے۔ میں نے اس کے سات ٹکڑے کر دیئے ہیں اور تم سب کو ایک ایک ٹکڑا سونپتا ہوں۔ جب تک یہ ساتوں ٹکڑے اکٹھے نہیں ہوئے جائیں گے کان کا صحیح راستہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم ساتوں مل کر اس کان کو دریافت کرو اور اس کی بے اندازہ دولت سے فیض حاصل کرو۔ اور نسل در نسل عیش کرو۔

اتنا کہہ کر نواب نے بے حد کوشش کر کے اس گول سے توے کے ساتوں ٹکڑے الگ کئے۔ یہ سب ٹکڑے دندانے دار تھے اور ایک جگ سا پزل ---- (Jigsaw Puzzle) کی طرح ایک دوسرے سے جڑ جاتے تھے۔ اور جب وہ جڑ جاتے تھے۔ تب ہی کان کا صحیح راستہ بتاتے تھے۔ الگ الگ ٹکڑوں سے سونے کی کان کا صحیح راستہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

نواب پرویز اختر نے سونے کے توے کے ساتوں ٹکڑے ہم ساتوں میں بانٹ دیئے۔ اسی بیچ میں اس پر خاموشی اور جانکنی کے کئی دورے پڑے۔ کئی بار ہم نے محسوس کیا کہ وہ حکایت پوری کرنے سے پہلے ہی مر چکا ہے مگر نہیں وہ زندہ تھا اور بار بار اپنی جاتی ہوئی طاقت کو مجتمع کر کے پھر بولنے لگ جاتا تھا۔ توے کے ساتوں ٹکڑے الگ کرنے کی آخری کاوش اس کے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئی مگر کسی نہ کسی طرح سے اس نے ساتوں ٹکڑے ہم ساتوں میں بانٹ دیئے اور پھر بیٹھنے کی پوزیشن سے پھیل کر بستر پر اوندھا ہو گیا۔

ہم لوگوں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھیک کئے۔ دروازہ کھول کر نرسوں اور ڈاکٹروں کو بلایا۔ ان لوگوں نے اس کا تنفس جاری کرنے کی بہتری کوشش

کی مگر وہ مر چکا تھا۔ شاید وہ ہمیں اپنا آخری راز بتانے ہی کے لئے زندہ تھا۔

اس رات ہم لوگ نواب کے شاہی محل ہی میں رہے۔ شام کو تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے۔ ہم سب لوگ بہت اداس اور تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ رات سہیل گڑھ کے محل ہی میں گزاری جائے اور دوسرے دن اپنے اپنے اڈے پر لوٹا جائے۔ پھر سات دن کے بعد اسی سہیل گڑھ میں اکٹھے ہو کر کانا ڈھونڈھنے کے سفر پر نکلا جائے۔

رات کو ہم جلد ہی سو گئے مگر مجھے نیند نہیں آئی۔ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ اٹھ کر ایک سگار پیوں۔ دل میں کچھ عجیب خلفشار سا تھا۔ نواب کے مرنے کا غم بھی تھا اور یوں یکایک لکھ پتی بن جانے کی مسرت بھی۔ بتی جلا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا تو معلوم ہوا کہ سگاروں کا ڈبہ بھائی کے کمرے میں بھول آیا ہوں۔ جو میرے کمرے سے ملحق تھا۔ گھڑی دیکھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ بھائی سو گیا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ پھر سوچا۔ کوئی حرج نہیں جگا لوں گا۔ سگار پینے کو بے حد جی چاہ رہا تھا۔ حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔

اپنے کمرے سے نکل کر میں نے ساتھ والے کمرے کو کھٹکھٹایا۔ دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی جب بھائی نے دروازہ نہیں کھولا۔ تو میں نے دروازے کو ذرا زور سے کھٹکھٹایا۔ زور لگانے پر دروازہ خود بخود دھڑ سے کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی کسی نے مجھ پر گولی چلائی۔ مگر نشانہ خطا ہو گیا۔ پھر کسی کے کھڑکی سے باہر کودنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے بتی جلائی۔ کمرے میں میرا بڑا بھائی، تمہارا باپ بستر پر زخمی پڑا تھا سینے سے خون بہہ رہا تھا اور کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ بستر کے قریب کھڑکی

کھلی تھی۔

"بھائی نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کیا۔ یکایک اس کا ہاتھ رک گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں جامد ہو گئیں اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

میرا بھائی مر چکا تھا۔

دلیپ کا چچا یہاں تک کہہ کر رک گیا۔ دلیپ نے محسوس کیا۔ اس کا گلا بھر آیا ہے۔ جسونت سنگھ نے رومال سے (اپنی) آنکھیں پونچھیں۔ چند لمحے ایک تکلیف دہ خاموشی میں گزرے۔ پھر دلیپ نے پوچھا۔

"میرے باپ کو کس نے مارا۔؟"

"گولی اس کے سینے کے پار ہو چکی تھی۔" جسونت سنگھ کے منہ سے نکلا۔

"مگر میرے باپ کو کس نے مارا۔؟"

"میں نے حملہ آور کی صورت نہیں دیکھی۔" اس کا چچا بولا۔

"کیونکہ حملہ آور فرار ہو چکا تھا۔ ہاں اپنے بھائی کے اشارہ کرنے کے بعد جب میں نے سرہانے کو ٹٹولا تو مجھے اس میں سے سونے کے توے کا وہی ٹکڑا مل گیا جو نواب نے میرے بھائی کو عطا کیا تھا۔ میرا خیال ہے حملہ آور جو کوئی بھی تھا ہم سائیوں میں سے تھا اور سونے کے اس ٹکڑے کو حاصل کرنے آیا تھا۔ جس پر سونے کی کان تک پہنچنے کا راستہ کھدا تھا۔ یعنی اس راستہ کا ایک حصہ۔"

دلیپ بولا۔ "یہ آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔؟"

اس کا چچا بولا۔ "تم میری پوری بات تو سن لو۔ اس کے بعد فیصلہ کرو۔

گلونت سنگھ کی موت کے بعد میں وہاں سے بھاگ لیا کیونکہ جس حملہ آور نے میرے بھائی کو ختم کردیا تھا اس نے مجھ پہ بھی گولی چلائی تھی۔ شاید وہ مجھ سے بھی سونے کے توے کا ٹکڑا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ میں نے بھانپ لیا تھا۔ وہ گنے کے ساتوں ٹکڑے حاصل کرکے اکیلا اور واحد اس سونے کی کان کا مالک بن جانا چاہتا تھا۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جب میں بھاگ کر اپنے گاؤں پہنچا تو گاؤں میں بھی ایک رات مجھ پر حملہ ہوا اور میں گاؤں چھوڑ کر شہر آگیا۔ شہر میں بھی ایک دن مجھ پر حملہ ہوا تو میں وہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلا گیا۔ وہاں پہ بھی میری غیر حاضری میں میرے گھر کی تلاشی کسی نے لی۔ ہر کونا کھدرا چھان مارا اور جب اسے وہ سونے کا ٹکڑا نہ ملا تو مجھ پر کسی نے سرِ شام بازار میں چاقو سے حملہ کیا قسمت اچھی تھی۔ میں اس سے بھی بچ نکلا۔ پھر میں نے سوچا جب تک میں ہندوستان میں رہوں گا خطرے میں رہوں گا۔ چنانچہ پاسپورٹ بنوا کر ایک دن خاموشی سے یہاں سے رخصت ہو گیا۔ اور پندرہ سال نیروبی میں رہا۔ نیروبی میں مجھ پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ غالباً حملہ آور یا حملہ آوروں کو میرا سراغ نہیں ملا تھا۔ اب پندرہ سال کے بعد میں واپس اپنے وطن میں آیا ہوں مگر اس سونے کی کان کی یاد مجھے اب تک ستاتی ہے۔ جس کی خاطر میرے بھائی کا خون ہوا۔"

چچا یہاں تک کہہ کر چپ ہو گیا۔ دلیپ بھی خاموشی سے اس کی داستان سُن رہا تھا۔ پھر چچا اپنی جگہ سے اٹھا۔ اپنے بستر کے قریب لوہے کی ایک الماری کو کھول کر اس نے اندر سے ایک فائل نکالی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔

"مگر میں یہاں آکر بیکار نہیں رہا۔ پہلے تمہارا پتہ چلایا کیونکہ یہ میرا فرض تھا۔

سپیرا دھر ایک سال میں مختلف جگہوں پر گھوم گھوم کر بقیہ پانچ آدمیوں کی تلاش پر ہزاروں روپئے خرچ کرکے میں نے ان پانچوں آدمیوں کے نام پتے اور تصویریں جمع کی ہیں جو نواب کے مرنے کے وقت اس کے بستر کے گرد موجود تھے۔ اور جنہیں وہ سات ٹکڑے عطا کئے گئے تھے۔ اور جن میں ایک آدمی تمہارے باپ کا قاتل بھی ہے۔

وہ نام پتے اور ان کے حالات اس فائل میں میں نے جمع کئے ہیں۔"

"کیوں۔؟"

"سونے کے اس نقشے کے دو ٹکڑے تو میرے پاس ہیں۔ ایک میرا، دوسرا تمہارے باپ کا یعنی میرے بھائی کا مگر ان دو ٹکڑوں کے سہارے سونے کی کان تک پہونچا نہیں جا سکتا۔ مجھے وہ باقی پانچ ٹکڑے چاہئیں۔ انہیں میں تمہاری مدد سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"میری مدد سے کیوں۔؟"

"کیونکہ وہ لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ پندرہ بیس برس گزرنے کے بعد بھی پہچان لیں گے۔ لیکن تم ان لوگوں کے لئے اجنبی ہو۔ تمہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ تم ان پانچوں کی کھوج میں جاؤگے تو انہیں تم پر کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس فائل کی مدد سے تم ان لوگوں تک پہونچو اور باری باری ہر ایک کے قریب جا کر ان سے وہ سونے کے ٹکڑے حاصل کرلو جن سے کان کا نقشہ مکمل ہوتا ہے ایسا کرنے سے نہ صرف تم عظیم دولت کے وارث ہوگے بلکہ تمہارے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ بھی لے سکوگے کیونکہ اس تفتیش کے دوران تمہیں یہ بھی معلوم ہو ہی جائے گا کہ ان پانچوں میں کون تمہارے باپ کا قاتل ہے۔؟

چچا کچھ دیر چپ رہا۔ اس کی نظریں دیر تک اپنے بھتیجے پر گڑی رہیں۔ پھر اس نے پوچھا۔

" دلیپ کیا تم اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکو گے۔؟ "

" ہاں چچا۔! میں ضرور اس کام کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر سونے کی کان کی خاطر نہیں۔ اپنے باپ کا بدلہ لینے کی خاطر۔ "

چچا بولا۔ " مگر اب وہ کان بھی ہماری ہونی چاہیئے جس کی خاطر تمہارے باپ کو مار ڈالا گیا۔ ایک طرح سے اب تم ہی اس کان کے وارث ہو۔ "

دلیپ نے مٹھی بھینچ کر کہا۔ " ہاں چاچا۔ میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے۔ میں ضرور اس کام کو پورا کرونگا۔ چاہے مجھے اس میں اپنی جان کی بازی بھی کیوں نہ لگانی پڑے۔ "

" اسی لئے میں نے تمہیں پہلوانی، جوڈو، کراٹے، شمشیر زنی، و النقل بازی میں طاق کر دیا ہے۔ اب تم خطرناک سے خطرناک صورت حاصل کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ تم جوان ہو اور طاقتور ہو اور ہر حملے سے نپٹنے کی قوت رکھتے ہو۔ "

پھر چچا جسونت سنگھ نے فائل دلیپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

" تین چار دن تک تم یہ فائل دل لگا کر پڑھو اور ان لوگوں کے حالات اور خصوصیات اور شخصی دلچسپیاں اور زاوئیے ازبر کر لو۔ سب تصویریں دیکھ لو۔ پتے یاد کر لو۔ اپنے ذہن میں ہر چیز بٹھا لو۔ اگلے تین چار دنوں میں تمہارے سفر کی تیاریاں بھی مکمل کر لیتا ہوں۔ تمہیں اکیلے ہی اس سفر پر جانا ہوگا۔ روپے پیسے کی تمہیں کوئی کمی نہ ہوگی۔ ایک معقول رقم تمہارے ساتھ کر دی جائے گی۔ اور جب

تم وہ پانچوں ٹکڑے حاصل کر لوگے تو سونے کا نقشہ مکمل ہو جائے گا۔ پھر تم مجھے تار دے دینا۔ میں تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔ پھر وہاں سے ہم دونوں اور صرف ہم دونوں نقشے کے مطابق کان کی جانب سفر کریں گے اور دنیا کے امیر ترین رئیس بن جائیں گے۔"

دلیپ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اس نے چچا کے ہاتھ سے فائل لے کر اسے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے چچا نے دو تین بار اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بے حد شفقت سے بولا۔

"اچھی طرح اس فائل کا مطالعہ کر لو اور اپنے ذہن میں سب کچھ محفوظ کر لو۔ کیونکہ یہ فائل تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ اگر کہیں یہ راستے میں گم ہو گئی۔ چوری ہو گئی ان پانچوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ پڑ گئی یا کسی دوسرے حملہ آور کے ہاتھ آ گئی تو ایک بکھیڑا کھڑا ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہی اپنی کوشش سے اس کان کا نقشہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور ہم دونوں منہ دیکھتے رہ جائیں۔ اس لئے اس فائل اس فائل میں درج شدہ تمام کوائف اور اطلاعات اپنے ذہن میں محفوظ کر لو۔ پھر یہ فائل اسی لوہے کی الماری میں واپس چلی جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔؟"

"ہاں چچا۔" دلیپ بولا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔"

O

جون کا مہینہ۔ گہرا نیلا آسمان کہیں کہیں بے حد سپید بادل لطیوں کی طرح تیرتے ہوئے۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی مہک۔ جہانگیر آباد پیلس کے قریب سے اوپر چڑھتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتے چلتے یکایک دلیپ نے رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے دور نیچے گرتی ہوئی ڈھلوانوں کے آخری سرے پر فلیٹ اور فلیٹ سے لگتی ہوئی نینی جھیل دکھائی دی۔ یہ جھیل نینی تال کی گھاٹیوں کے بیچ ایک زمردیں نگینے کی طرح جڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور اس جھیل کے تین طرف بار، کلب، بازار، ہوٹل، گھر اور چہل قدمی کرنے والے لوگ کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دلیپ نے نتھنے پھلا کر زور سے سونگھا جیسے وہ فضا کی ساری پاکیزگی کو اکدم لے جائے گا۔ پھر وہ فر اور پائن کے گھنے جنگل میں گھومتی پگڈنڈی پر چڑھتا چلا گیا۔

راوت لاج چاینا پیک کی طرف جاتے ہوئے نینی تال کے حلقے کا آخری لاج تھا۔ اور تیر کی شکل میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے تین ونگ تھے۔ دائیں ونگ میں نوکر خانہ تھا۔ بائیں ونگ میں مہمان خانہ اور بیچ کے ونگ میں خود ٹھاکر سنگھ راوت رہتا تھا۔ بیچ کے ونگ کے اوپر ایک اور کمرہ تھا۔ جہاں ہر روز ٹھاکر سنگھ راوت پوجا کرنے جاتا تھا۔ راوت کی عمر پچاس سے اوپر ہو گئی مگر اس کی آنکھیں ابھی تک عقاب کی طرح تیز تھیں۔ اور وہ اپنے علاقہ کا بہترین شکاری مانا جاتا تھا۔ اور تاریخ میں لکھا تھا کہ جب تک ٹھاکر سنگھ راوت نواب کی نوکری میں رہا۔ وہ نواب کا بہترین شکاری مانا گیا تھا۔ نواب اس پر بہت مہربان تھا۔ اور وقتاً فوقتاً اسے انعام واکرام سے نوازتا رہتا تھا۔

راوت بھی حملہ آوروں سے بچنے کے لئے کئی برس ہندوستان سے باہر رہا۔ برما، لنکا، ملیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، ادھر کے علاقے اسے بہت پسند تھے اب پانچ برس سے وہ نینی تال میں مقیم تھا۔ ان علاقوں کی سیاحت کے بعد وہ سنگاپور سے ایک مخلوط خون کی بچی لڑکی آنا وانگ لے کر آیا تھا۔ جس کی ماں چینی تھی اور باپ ملائی اور آنا گلابا جیسی نابیو ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ راوت کو آنا بہت پسند تھی۔ آنا راوت کو کتنا پسند کرتی تھی۔ یہ کہنا دشوار ہے۔ بہر حال سنگاپور میں اس نے جو غریبی دیکھی تھی اس کے مقابلے میں نینی تال کی آسائش سے بھرپور زندگی

کو وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی۔

جس وقت دلیپ جنگل کی پگڈنڈی پر چڑھ رہا تھا۔ راوت اپنی لاج کے باہر کھلے باغیچے میں لوہے کے ایک اسٹینڈ پر لکڑی کے ایک گول پر خود کو چڑھائے اس پرانی چاقو بازی کی مشق کر رہا تھا۔ یہ اس کی روزمرہ کی مشق تھی۔ آنا لکڑی کے ایک بکسے سے اسے باری باری ایک ایک چاقو نکال کر دیتی جاتی اور وہ اسے نشانہ بنا کر لکڑی کے خود پر پھینکتا جاتا اور دھیرے دھیرے اس کا نشانہ مرکز کے قریب جا رہا تھا۔

یکایک چاقو بازی کرتے کرتے راوت کا ہاتھ رک گیا۔ کیونکہ پیچھے سے ایک اور چاقو فضا میں سنسناتا ہوا سیدھا لکڑی کے خود کے مرکز میں گھس گیا تھا۔ راوت نے مڑ کر دیکھا۔

پیچھے دلیپ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

پھر آنا نے مڑ کر دلیپ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ چلبلی ہونے کے باوجود آنا بلند قامت تھی۔ یہ دکیہڈ کا ایک سنہری گون پہنے تھی جس سے اس کی پتلی کمر کا خم بے حد واضح ہو گیا تھا۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے دلیپ کی طرف دیکھا ایک تو آنکھیں ترچھی۔ پھر نگاہیں ترچھی۔ پھر ان کا زاویہ ترچھا۔ دلیپ کو اپنے دل میں کوئی تیر سا چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ لڑکی خطرناک ہے۔ اس نے سوچا۔

راوت کو پہلے تو غصہ آیا۔ پھر دلیپ کا صحیح نشانہ دیکھ کر تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ راوت کھلے دل کا مخلص آدمی تھا۔ تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر جب چاقو بازی کے بعد راائفل کے نشانے میں بھی اسے طاق دیکھا تو دلیپ کا گرویدہ ہو گیا۔

سہ پہر میں وہ تینوں جائینا پیک گھوڑوں پہ سوار ہو کر گئے۔ راوت کو گھوڑ سواری کا بھی بہت شوق تھا۔ اور اس کے اصطبل میں سات عدد ایک سے ایک عمدہ گھوڑے تھے۔ جائینا پیک کی سمت جاتے جاتے راوت نے محسوس کر لیا کہ دلیپ گھوڑ سواری کے فن میں بھی ماہر ہے پھر جب راوت کو معلوم ہوا کہ نواب مزمل اللہ خاں کو ایک شکاری کی ضرورت تھی۔ اور اس نے دلیپ کو انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دلیپ کو انٹرویو کر سکتا نواب مزمل اللہ خاں اپنے کسی کام سے نیویارک چلا گیا اور دلیپ کے لئے کسی طرح کی ہدایت نہیں چھوڑ گیا۔

تو راوت نے دلیپ کی مشکل آسان کر دی۔ اس نے دلیپ کو اپنے یہاں ایک شکاری کی حیثیت سے نوکر رکھ لیا۔ جب تک نواب مزمل اللہ خاں نیویارک سے واپس نہ آجائے وہ اس کے پاس قیام کر سکتا تھا۔ اور اس کے شکاری کی حیثیت سے تنخواہ پا سکتا تھا۔ نواب مزمل اللہ خاں کے آنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا۔ وہ جہاں چاہے ملازمت کر سکتا ہے۔

دلیپ نے راوت کا شکریہ ادا کیا اور راوت نے آنا سے کہا کہ وہ دلیپ کے لئے مہمان خانے میں ایک کمرہ ٹھیک کر دے۔

جب آنا دلیپ کے ساتھ کمرہ دکھانے چلی تو دلیپ کو محسوس ہوا کہ آنا کی چال بڑی دلکش ہے۔ اور اس کے گون سے پیرس کی کسی مہنگی خوشبو کی مہک آتی ہے۔

آنا نے دلیپ کو اس کا کمرہ دکھایا۔ یہ بیڈ ہے۔ یہ وارڈ روب۔ یہ رائفل رکھنے کی جگہ۔ یہ ٹیلیفون۔ یہ باتھ روم۔ شاور، تولئے۔ صابون۔ یہ برآمدے میں چائے پینے کی میز اور چار کرسیاں بیدکی۔ اندر کمرے کے ایک کونے میں وائین کیبنٹ اور ریکارڈ کا چھوٹا

سافر جیڈیر۔ جس میں کچھ پھل اور چھوٹی بوتلیں سوڈے کی رکھی ہوئی تھی۔ کئی دفعہ کمرے کا سامان اور باتھ روم دکھاتے ہوئے آنا کے ہاتھ اور اس کا بدن دلیپ کے بدن سے مس ہو گیا اور دلیپ کو محسوس ہوا جیسے وائین خون میں مل کر گردش کر رہی ہو۔ چلتے وقت آنا نے ایک واپسی نگاہ اس پر ڈالی اور ڈھلتے ہوئے چلی گئی۔ دلیپ نے سوچا۔ کاجل والی کی طرح اس عورت کی نگاہیں بھی بڑی مردمار ہیں۔ مگر اس کے بدن سے بھاجی کی بو نہیں آتی۔ اس کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی مگر اس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ سب سے پہلے مجھے سوچنا چاہیئے۔ کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ نہیں نہیں۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اسے بڑی سختی سے اپنے محسوسات پر قابو پانا ہوگا۔ ہاں مگر اس عورت کی نگاہیں تیر کی طرح بدن میں چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں گرنے کو تیار تھی۔ مگر نہیں۔ نہیں کوئی گڑبڑ نہیں۔ وہ موقع ملتے ہی اپنا کام کرے گا۔ اور چلا جائیگا۔ عورتوں کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔ پہلے کام.....

دلیپ ناشتہ کرکے رسوئی کے قریب سے گذرا اور بابو رام باورچی کو دیکھ کر مسکرا دیا اور بابو رام بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ حالانکہ وہ اس وقت ٹھاکر سنگھ کے لئے دودھ اونٹا رہا تھا۔

"اندر آؤ۔" ٹھنگنے سانولے بابو رام نے دلیپ سے کہا۔ دلیپ رسوئی کے اندر چلا گیا۔ جس کام کے لئے وہ آیا تھا اس کے لئے اسے ہر ایک کو دوست بنانا ہوگا۔

اس نے بابو رام سے پوچھا۔ "اس دودھ کا رنگ گلابی کیوں ہے۔؟"

"تین گھنٹے سے مدھم آنچ پر پک رہا ہے۔ مالک ایسا ہی پکا ہوا گلابی دودھ پیتے ہیں۔" بابو رام نے جواب دیا۔ پھر وہ ایک گلاس بادام میں ڈھکے اور رات کے بھیگے ہوئے اور چھلے ہوئے بادام لے کر انہیں دودھ میں ڈال کر بولا۔

"تم نئے شکاری آئے ہو۔؟"

"ہاں۔"

"افضل شکاری کو جانتے ہو۔؟"

"نہیں۔"

"وہ مالک کا پرانا شکاری ہے۔ تمہیں دیکھ کر خوش نہیں ہو گا۔"

"افضل ہے کہاں، ہم نے نہیں دیکھا۔" دلیپ نے پوچھا۔

"چھٹی پر گیا ہے۔ جب آئے گا، جب تیری مرمت کرے گا۔"

مرمت کے خیال سے بابو رام کی چھوٹی چھوٹی بیوے کی سی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"میری مرمت کوئی نہیں کر سکتا۔" دلیپ غرّایا۔ پھر دل میں سوچنے لگا۔ اس رسوئیے سے دوستی کرنا بڑا مشکل ہے۔

"تمہارا نشانہ کیسا ہے۔؟" بابو نے پھر پوچھا۔

"افضل آ جائے تو مقابلہ کر کے دیکھ لو۔" دلیپ نے کامل اطمینان سے جواب دیا۔

"تم بھڑوں کے چھتے میں آ گئے ہو۔" بابو نے اسے اطلاع بہم پہنچائی۔

"کون بھڑ ہے یہاں۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

"کون نہیں ہے۔" بابو رام بولا۔ "مالک سے لیکر نیچے رسوئیے تک ...." وہ چپ ہو گیا۔

"مجھے تو تم شریف آدمی لگتے ہو۔"

"کون کیا لگتا ہے اس گھر میں کس کو معلوم ہے ۔ ؟" بابو نے گلابی دودھ میں پستہ ڈال کر اسے ریشمی لیس کی جالی سے ڈھک کر دلیپ کو دے کر کہا۔

" ایک کام کروگے ۔ ؟"

" بولو ۔ "

" یہ دودھ کا گلاس مالک کو دے آؤ ۔ وہ پوجا کے بعد یہ دودھ فوراً ہی پیتے ہیں ۔ "

" تم خود کیوں نہیں جاتے ۔ "

" دیکھتے نہیں ہو رسوئی میں کتنا کام ہے ۔ ؟"

" تمہارا مددگار کوئی نہیں ۔ ؟"

" فی الحال تو تم ہو ۔ دوسرا خوشحال ہے ۔ وہ آنا میم صاحب کے لئے ناشتہ دینے گیا ہے ۔ "

دلیپ نے دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیا ۔ اس نے دیکھا گو بابورام کے ہونٹ سنجیدہ ہیں لیکن اس کی آنکھیں شوخی سے مسکرا رہی ہیں ۔

وہ ان آنکھوں کی شوخی سمجھ نہ سکا ۔

دلیپ نے چلتے چلتے پوچھا ۔ مالک کہاں ہوں گے ۔ ؟"

بابو بولا ۔ " اوپر ٹھاکر میں پوجا کے لئے گئے تھے ۔ شاید اب نیچے اپنے کمرے میں آگئے ہوں گے ۔ "

دلیپ نے پہلے ٹھاکر سنگھ کا کمرہ دیکھا ۔ وہ اس میں نہیں تھا ۔ رجنی نوکرانی سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی اوپر ہیں ۔ "ٹھاکر میں پوجا کر رہے ہیں ۔ وہ اوپر ٹھاکر کی طرف چلا ۔

رجنی سے اس نے ٹاور پر جانے کا راستہ پوچھا۔

رجنی نے اسے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ ہاں آنکھیں اس کی بھی شوخی سے مسکرا رہی تھیں۔ بابو رام اور رجنی دونوں کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ جیسے کسی دلچسپ شرارت سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔

وہ ٹاور کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

پوجا کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ دلیپ کواڑ کھٹکھٹائے بغیر باہر کو برآمدے میں ایک طرف دودھ کا گلاس لے کر کھڑا ہو گیا کہ جب ٹھاکر جی پوجا سے فارغ ہو کر نکلیں گے وہ دودھ کا گلاس اُن کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ میری مستعدی پر کس قدر خوش ہوں گے مجھے اس ٹھاکر کے بچے کو ہر طریقے سے خوش کر کے رام کر لینا ہے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پوجا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ٹھاکر سنگھ برآمد ہوا۔ دلیپ کو دیکھتے ہی وہ ایک دم ٹھٹھک سا گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، زور کا ایک تھپڑ دلیپ کے گلے پر رسید کیا۔ تھپڑ اس زور کا تھا کہ دلیپ لڑکھڑا کر چند لمحوں کے لئے چکرا گیا۔

دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر لکڑی کے فرش پر پھسلتا چلا گیا۔

ٹھاکر سنگھ غصہ میں بپھر کر بولا۔ "تمہیں یہاں ٹاور میں آنے کی اجازت کس نے دی ہے؟"

دلیپ کا سارا بدن سر سے پاؤں تک انگارے کی طرح دہکنے لگا۔ آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اس نے ایک تھپڑ کا جواب دس تھپڑوں سے نہ دیا ہو۔ لیکن نہیں اسے اس وقت اپنے آپ پر جبر کرنا ہو گا۔ دلیپ نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے باندھ لئے اور سر جھکا کر بولا۔ "مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ اِدھر آنا منع ہے۔ میں تو آپ کے لئے

رسوئی سے دودھ لا رہا تھا۔ بابورام بولا کہ مالک پوجا کے فوراً بعد دودھ پیتے ہیں۔ میں نے سوچا۔ پوجا روم کے باہر دودھ لے کر کھڑا رہوں گا۔"

"اور تم کو کسی نے نہیں بتایا کہ ادھر اوپر ٹاور میں آنا منع ہے۔" ٹھاکر سنگھ گرج کر بولا۔

"نہیں مالک۔" دلیپ آہستہ سے بولا۔ مگر اب اس کی نگاہ میں بابورام اور رجنی کی شوخ مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ اب وہ اس کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ دونوں نے جھکا کر اسے بھڑایا تھا۔

یکایک ٹھاکر سنگھ کا سارا غصہ ڈھل گیا۔ تھوڑی دیر میں مسکرانے لگا۔ پھر اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

"نوکر لوگ کی شرارت ہے۔"

"نہیں مالک۔!" دلیپ بولا۔ "غلطی مجھ سے ہوئی۔ مجھے پوچھ لینا چاہیے تھا۔"

"اچھا تو کان کھول کر سن لو۔ اِدھر میری پوجا کا ٹاور ہے۔ اِدھر میرے سوا کوئی نہیں آ سکتا۔ منع ہے۔ سمجھ گئے۔ میں پوجا کے بعد دودھ ضرور پیتا ہوں مگر نیچے اپنے کمرے میں جا کر۔"

ٹھاکر سنگھ آگے آگے سیڑھیاں اترنے لگا۔ پیچھے دلیپ چلنے لگا۔ اور سیڑھیاں اتر کر ٹھاکر سنگھ نے فولادی کمانیوں والا دروازہ سیڑھیوں کے آگے پھیلا کے تالہ لگا کے بند کر دیا۔ اور دلیپ سے بولا۔

"جاؤ بابورام کو کہو۔ دوسرا دودھ گرم کر کے لائے۔"

دلیپ رسوئی کی طرف چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے کوریڈور کے ایک کونے میں رتنا کو اپنے منہ میں کپڑا ٹھونسے ہنستے دیکھا۔ ساری ہنسی اس کی سمت ٹکرا آنکھوں میں آگئی تھی۔ دلیپ نے منہ موڑ لیا اور رسوئی کی طرف چل پڑا۔ وہ یقیناً بابو رام سے بھی نہیں لڑے گا۔ کسی سے بھی نہیں۔ وہ ہر ایک سے میٹھا برتاؤ کرے گا۔ ہاں۔ ہاں اُسے یہی کرنا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکر سنگھ بے حد مضبوط اور کسرتی بدن کا مالک ہے۔ مگر وہی اس سے اوپر ہے۔ اور وہ دس منٹ سے زیادہ دلیپ کے تھپڑوں کی مار نہیں سہہ سکتا تھا۔ تو بھی دلیپ نے اسے کچھ نہیں کہا۔ کسی دن وہ اسے بتائے گا۔ مگر آج نہیں۔ اُسے وہ سونے کے پترے میں فٹ ہونے والا سونے کا ٹکڑا چاہیئے۔ دلیپ نے رسوئی کی طرف جاتے جاتے دانت پیس لئے .... وہ بہت نرم دل۔ ریشم کی طرح ملائم اور شہد کی طرح میٹھا ثابت ہوگا۔ ایک چھوٹے سے حقیر غلیظ سونے کے پترے کے لئے۔

آدھی رات کے وقت کسی نے بڑی مدھم دستک سے دو تین بار اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس نے دروازے کی چٹخنی دھیرے سے کھولی اور خود ایک طرف ہو کے دروازہ جھٹ سے کھول دیا۔ رات کے وقت دروازے کے سامنے نہیں رہنا چاہیئے۔ کوئی بھی پہلے وار میں ختم کر سکتا ہے۔

دروازہ کھلتے ہی خوشبوؤں کا ایک جھونکا اندر آیا۔ پھر آنا وانگ اندر آئی۔ اس نے شب خوابی کا ایک زرد گون پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کا گلابی پھول کا سا بدن سارے کا سارا جھلکتا تھا۔

اندر آتے ہی اس نے چٹخنی لگا دی۔

"مگر۔!" دلیپ نے احتجاج کیا۔

"وہ افیم کھا کے سو گیا ہے۔ صبح سے پہلے اٹھے گا نہیں۔" آنا نے اُسے بتایا۔

"مگر یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ٹھیک نہیں ہے۔؟" آنا غصّہ سے چمک کر بولی۔

"پچپن برس کے بڈھے کو بائیس برس کی لڑکی کے بدن سے کھیلنے کا کیا حق ہے۔؟"

"یہ حق تم نے اُسے دیا ہے۔" دلیپ بولا۔

"میں نے نہیں، میری غریبی نے اُسے دیا ہے۔" آنا تلخ لہجہ میں بولی۔

"مگر کیا تم مجھے ساری رات یہاں اس سردی میں فرش پر کھڑا رکھو گے۔؟"

وہ پہلے ہی محسوس کر چکا تھا کہ آنا خطرناک طور پر حسین ہے لیکن کس قدر حسین ہے اس کا اندازہ اسے اس وقت شب خوابی کے لباس میں دیکھ کر ہوا۔ وہ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ کسی نئی ترغیب کی طرح ـــــ پھر وہ اس کے بستر پہ دراز ہو گئی۔ خود بخود، سلیپروں سمیت۔

"میرے سلیپر اتار دو۔" آنا نے اترا کر کہا۔

دلیپ نے بے خود ہو کر اس کے مخملیں سلیپر اپنے ہاتھ سے اتار دیئے ان سفید پیروں اور ٹخنوں کو چھونے سے اسے خیال آیا، کیوں نہ وہ اس کے سارے کپڑے اتار دے پھر اس نے اپنے آپ کو کسی طرح روک دیا۔

بولا۔ "میں اس کا نوکر ہوں۔"

وہ بولی۔ "نوکر ہی تو مالکن کی خوشی پوری کرتے ہیں۔ یعنی مالک اگر بڈھا ہو تو۔"

"تو بڈھے سے شادی کیوں کی۔؟"

"شادی کہاں کی ہے اس نے۔ بس رکھ چھوڑا ہے۔"

"تو اسے چھوڑ کے چلی جاؤ۔"

"کہاں جاؤں۔ سنگا پور میں۔؟ ماں باپ کی اس چھوٹی سی سمپان میں جس میں میرے چھ بھائی بہن جھینگوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ غلیظ پانی، بد بو، سڑاند، فاقے، پھٹے کپڑے......"

دلیپ اپنے بستر کے ایک کونے پہ بیٹھا تھا۔ وہ اس کے بستر پہ دراز تھی پھر یکایک دھا نشو کر بیٹھ گئی۔ زرد گاؤن کی جیب سے اس نے سگرٹوں کا ایک پیکیٹ نکالا۔ اور ایک لائٹر۔ ایک سگریٹ دلیپ کو دیا۔ دوسرا خود لیا۔ دلیپ نے دونوں سگریٹ سلگائے۔ دھواں دونوں کے گرد بکھر گیا۔ دلیپ خود بخود آنائے قریب کھسکتا چلا گیا۔ گو اُسے محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اس کے قریب کھسکتا چلا جارہا ہے۔

آنا نے اس کے کندھے پر اپنا گال رکھ دیا۔ بڑی نرمی سے بولی۔

"اس نے تمہیں چانٹا مارا۔"

دلیپ کے دونوں کندھے سخت ہو گئے۔ سخت لہجہ میں بولا۔

"تمہیں کس نے بتایا۔؟"

"نوکروں نے۔"

دلیپ کے بدن سے چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ اس لمحہ میں وہ ٹھاکر سنگھ کی جان تک لے سکتا تھا۔

دوسرے ہی لمحہ میں آنا اس کے کندھے اور پیٹھ تک کی مچھلیاں ٹٹولتی ہوئی بولی۔

"تم بہت مضبوط ہو۔ مجھے معلوم ہے تم اُسے ہرا سکتے تھے۔ مگر تم بھی اسی غریبی کے مارے ہوئے ہو۔ ہے نا۔؟"

"ہاں۔!" دلیپ نے اسے صحیح حقیقتِ حال سے خبردار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"معلوم نہیں اس ٹاور میں کیا ہے۔ جس کے لئے وہ ہر کسی کو وہاں جانے کو روکتا ہے۔ ایک دفعہ میں بھی وہاں جانے کی غلطی کر کے پٹ چکی ہوں۔"

"تم بھی۔ تم بھی۔؟"

"ہاں ایک بار نہیں کئی بار۔ مگر وہ دوسری باتیں تھیں۔ ٹاور پر جانے کی غلطی صرف ایک بار مجھ سے ہوئی۔ کوئی بات ضرور ہے۔ وہاں پر۔!"

دلیپ کے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ اس لئے اپنی دلچسپی روک کر معمولی لہجہ میں کہا۔

"نہیں، مورتی تو سنگِ مرمر کی ہے۔ میں نے چھپ کر دیکھ لیا تھا۔"

دلیپ کے دماغ میں دوسری بار زور سے گھنٹی بجی۔

"کچھ ہوگا۔ چلو چھوڑو نہیں کیا۔" دلیپ نے خوش اسلوبی سے بات

کوشال دیا۔

سگریٹ کے دو چار کش لینے کے بعد دلیپ اپنے سارے بدن میں پھریری سی محسوس کرنے لگا۔

اس نے آنا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔ "اس سگریٹ میں کیا ہے۔ ضرور کچھ ہے۔ ؟"

"ہاں۔ میری خواہش ہے۔"

"اور تمہاری خواہش کیا ہے۔ ؟" دلیپ نے سوال کیا حالانکہ اسی لمحے اسے اپنا سوال بے معنی معلوم ہوا۔

آنا کچھ نہیں بولی۔ اس کے بدن سے پیرس کی کسی مہنگی خوشبو کے علاوہ کسی شعلہ ساماں جذبے کی لپٹیں بھی آ رہی تھیں۔ آنا نے اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے زور کا ایک گہرا سانس اس کی گردن سے لے کر رخسار تک کھینچ دیا۔ دلیپ کو لگا جیسے کسی شعلے کی لپلپاتی لکیر اس کی گردن سے رخسار تک کھینچ گئی۔

"مجھ سے پہلے کون تھا۔ ؟" دلیپ نے عجیب گھٹے سے لہجہ میں پوچھا کیونکہ وہ برابر بند باندھ رہا تھا۔ اپنے آپ کو روک رہا تھا۔ مگر جذبات کے تیز دھارے اس باندھ کو توڑے ڈال رہے تھے۔

"افضل تنکاری۔" آنا کے ہونٹوں سے نکلا۔ "وہ جس کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔"

دلیپ کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی۔ رشک، حسد اور رقابت جلن کا احساس اس کے رگ و پے میں طوفان کی طرح بپھرنے لگا۔ خون لاوے کی طرح

اُبلنے لگا۔ اس کے منہ سے دبی گھٹی سی غرّاہٹ نکلی کسی شکاری چیتے کی سی آواز۔ اس نے زور سے آنا کو پکڑ لیا۔ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے نے آنا کی زرد ریشمی گاؤن کو پھاڑ ڈالا اور اس پر ایک بھوکے بھیڑیئے کی طرح پل پڑا۔

آنا کے ہونٹوں سے دبی دبی سی خوشی کی چیخ نکلی۔ اس کا آخری حربہ کامیاب رہا۔

اب وہ آنا کے قریب ایک ایسے بھولے بچے کی مسکراہٹ لئے سو رہا تھا جس نے پیٹ بھر دودھ پی لیا ہو۔

عورتیں جان جاتی ہیں اور آنا کو بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں پہلی عورت ہے۔ ایک عجیب سی خوشی، مسرّت، تفاخر، کامرانی فتح کی نگاہوں سے وہ اپنے قریب سوئے ہوئے دلیپ کو دیکھ رہی تھی۔ عجیب سا پیار آ رہا تھا۔ اُسے دلیپ پر کسی کا بھی پہلا جذبہ ہو اس میں اک عجیب سا تقدس سا چھپا رہتا ہے۔ آنا کو محسوس ہوا کہ جیسے دلیپ کے پہلے جذبے کے تقدس نے اسے بھی چھو لیا ہے۔ اس نے بے اختیار جھک کر دلیپ کا گال چوم لیا۔ مگر دلیپ بدستور گہری نیند سوتا رہا۔۔۔

آنا نے تپائی سے اپنی گھڑی اٹھا کر دیکھی۔ صبح کاذب میں دو گھنٹے کے قریب باقی ہیں۔ اسے چلنا چاہیئے۔ بلاشبہ ٹھاکر سنگھ افیم کے زیر اثر دیر تک سوتا ہے مگر میری احتیاط ضروری ہے۔

اس نے گھڑی کلائی سے باندھی، اپنے کپڑے سمیٹے، چاروں طرف غور سے دیکھا اس کی کوئی چیز تو یہاں نہیں رہ گئی ہے۔ اور جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ دبے پاؤں دلیپ کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح اٹھ کر دلیپ کو بہت سی باتیں یاد آئیں لیکن جس بات کا سُر سب سے اونچا تھا وہ یہ تھا کہ کل رات یکایک ایک لڑکے کی سطح سے اٹھ کر مرد بن گیا ہے۔ ایک جوان مرد۔ کچھ دیر تک وہ اس نئے جذبے سے کھیلتا رہا۔ اور دھنک کے کتنے ہی رنگ اسکی نگاہوں میں کھلتے رہے۔

پھر دوسری بات جو ایک دھکے کے ساتھ اس کے ذہن سے ٹکرائی وہ ٹاور کے متعلق تھی اور اسے آنا کا وہ فقرہ یاد آیا۔ "اس ٹاور میں ضرور کچھ ہے۔" یکایک وہ بالکل جاگ گیا۔ ضرور اس ٹاور میں کچھ ہے۔ اس کے دل میں شبہ اٹھنے لگے۔ ممکن ہے یہی وہ سراغ ہو جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ یہ سراغ اتنی جلدی اسے مل جائیگا اس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔

مگر اب اُسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ اس ٹاور پر جانے کیلئے

اسے بے حد احتیاط سے کام لینا ہوگا تاکہ ٹھاکر کے دل میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو جائے۔
وہ کچھ لمحوں کے لئے اس خیال سے کھیلتا رہا کہ وہ اس سلسلہ میں آنا کو اپنا ہمراز بنا لے۔
پھر سوچ کر اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔

پوجا کے بعد ٹھاکر پر جانے والی سیڑھیوں کا راستہ آہنی جنگلے سے بند ہو جاتا تھا۔ اور اس پر تالا چڑھا دیا جاتا ہے۔ کیوں ؟ اگر مورتی سونے کی نہیں ہے چاندی کی نہیں ہے۔ صرف سنگ مرمر کی ہے تو اسقدر احتیاط کیوں لازم ہے ؟
اسے معلوم کرنا ہی پڑیگا۔

اگلے چند دنوں میں اس نے اپنے آپ کو نوکر خانے کی مشین کا ایک کارآمد حصہ بنا لیا۔ اس کا اسے یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ اپنے کام کے سلسلہ میں گھر کے مختلف گوشوں سے واقف بھی ہو گیا۔ تھوڑے عرصہ میں وہ عداوت بھی دھل گئی جو کسی نئے نوکر کے آنے پر پرانے نوکروں کو ہوتی ہے۔ خصوصاً بابورام اور رجنی اس کے خاص طور پر شکر گذار تھے کہ اس نے ان کی چغلی نہیں کھائی تھی۔ بہت جلد دلیپ نے اپنا مقام اس گھر میں پیدا کر لیا۔

تہہ بنگلے کے قریب سے آتے جاتے اس نے اس مضبوط تالے کو دیکھا اور اُسے کھولنے کے لئے جس سامان کی ضرورت تھی۔ موقع پا کر اس نے ایک پتلا سا لوہے کا تار بھی حاصل کر لیا اور اسے نیچے بازار میں جا کر لوہار سے ایک خاص شکل میں تیار کرا لیا۔
اب وہ محض موقع کی تلاش میں تھا مگر یہ موقع اسے مل نہ رہا تھا۔ آنا کا وہ شدت سے انتظار بھی کرتا تھا۔ اور آنا کی آمد سے اسے سب سے زیادہ خطرہ بھی تھا۔ اگر یہ بات کھل گئی تو ٹھاکر سنگھ اس کی جان لینے کی کوشش کرے گا۔ اور دلیپ کی ساری محنت چوپٹ

ہو جائے گی۔

پھر یہ بھی تھا کہ آنا کی آمد سے وہ کہیں راتوں کو جا نہیں سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ آنا ہر رات نہیں آتی تھی کبھی کبھار آتی تھی۔ اور کبھی اسے بتا کر نہیں آتی تھی۔ وہ دلیپ سے بھی محتاط ثابت ہوئی۔ دن میں اس سے کبھی نرمی اور شائستگی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کا لہجہ خاص طور پر دلیپ کے لئے بے حد تحکمانہ اور کڑوا ہوتا۔ جس کا ٹھاکر سنگھ کبھی کبھی برا بھی مانتا اور اسے اپنا لہجہ بدلنے کے لئے تہدید بھی کرتا مگر آنا......
بدستور دلیپ سے اپنی نخوت کا اظہار کرتی رہی۔ آنا کے پاس یہی تو ایک ڈھال تھی جس سے وہ ہر شبہ کا وار خالی دے سکتی تھی۔

پھر آنا یکایک بیمار پڑ گئی۔ کوئی خطرناک بیماری نہیں۔ محض فلو اور بخار ڈاکٹر نے سات دن کے لئے آنا کو بستر پر لٹا دیا۔ سات دنوں کے لئے وہ مطلق دلیپ کے پاس نہیں جا سکتی۔ ان سات دنوں میں دلیپ کو اپنا کام ختم کر لینا ہوگا۔

سب سے پہلے نادر کو دیکھنا ہوگا۔ پھر ٹھاکر سنگھ کا بیڈ روم۔ پھر دوسرے کمرے۔ یوں تو وہ ایک عرصہ سے گھر کے مختلف حصوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ مگر آنا کی بیماری کے بعد اس نے اپنی تلاش تیز کر دی۔ اس کے باوجود گھر کے مختلف کمروں میں اسے اس سونے کے ہیرے کا کوئی سراغ نہ ملا۔

پھر جس رات اس نے نادر پر جانے کا پروگرام بنایا اسی دن دوپہر میں ٹھاکر سنگھ راوت اسے لے کر شکار کے لئے نکل گیا۔ رات کو اسے ترائی کے علاقوں میں لے گیا۔ بانسوں کے جنگل اور لمبی کھردری گھاس کے میلوں تک پھیلے ہوئے جنگل۔ وہ پندرہ دن ان جنگلوں میں رہے اور ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ مشترکہ

خطرے بہت سی دوریوں کو مٹا کر ایک دوسرے کے قریب لے آتے ہیں۔ اور یہ قربت جنسی قربت سے بہت الگ ہوتی ہے اور زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ جنس کی بھوک ختم ہو سکتی ہے۔ بدن کی مہک مٹ سکتی ہے لیکن اس قربت کی مہک نہیں مٹ سکتی۔ کبھی کبھی دلیپ اپنے کو مجرم سا محسوس کرتا۔ یہ راوت اتنا سچا کھرا اور کھلے دل کا آدمی ہے اور وہ اس کو دھوکا دینے آیا ہے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ راوت کو سب بات بتا دے۔ پھر جب اسے خیال آتا ممکن ہے اسی آدمی نے اس کے باپ کا قتل کیا ہو تو اس کا ارادہ بدل جاتا اور قربت کی روشھنڈی پڑنے لگتی اور محسوسات منجمد ہو کر اس کے کھرے جذبات پر برف کی تہیں چڑھا دیتے۔

ان پندرہ دنوں میں دلیپ نے جی بھر کر راوت کی خدمت کی، محض ایک شکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نوکر کی حیثیت سے بھی کسی کام سے اُسے عار نہ تھا۔ سوائے کھانا پکانے کے نگر ایک سوئیا ان کے ساتھ تھا۔ رات کو جب راوت بہت تھک جاتا تو گھنٹے دو گھنٹے دلیپ اس کی مٹھی چاپی بھی کرتا۔

ترائی کے جنگلوں میں انہوں نے کئی چیتل مارے اور ایک تیندوا بھی نیپال کے علاقے میں گھس کر انہوں نے ایک بارہ سنگھے کا شکار بھی کیا۔ اس مہم سے ٹھاکر سنگھ خوش خوش لوٹا۔ دلیپ اسے افضل سے بھی بہتر شکاری ملا تھا۔ اور بے چوک نشانہ تھا دلیپ کا۔

واپسی میں نینی تال سے آٹھ میل کی دوری پر شیو گاؤں کے قریب

دلیپ اُتر گیا۔ اس نے بہانہ بنایا کہ شیو گاؤں میں اس کی ایک موسی رہتی ہے اور جب سے وہ ٹھاکر سنگھ کے یہاں ملازم ہوا ہے ایک دفعہ بھی اپنی موسی کے یہاں نہیں گیا۔ وہ بس ایک رات کے لئے اپنی موسی کے یہاں رہے گا۔ دوسرے دن صبح پلٹ آئے گا۔ ٹھاکر سنگھ نے اسے خوشی سے اجازت دیدی اور دلیپ اپنا جھولا اور بستر لے کر سڑک کے کنارے اتر گیا۔ اور شیو گاؤں کی طرف چلا گیا۔

آدھی رات کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں تھا۔ اس کے جھولے میں اس کی قیمتی فائل کے علاوہ نقب زنی کا سارا سامان تھا۔ اس کے چچا نے یہ جان کر کہ ایسی قیمتی چیز جس سے سونے کی کان کا سراغ لگایا جائے کوئی بھی ذکی ہوش آدمی اسے تجوری سے الگ کسی محفوظ جگہ نہیں رکھے گا۔ اس لئے اس نے اپنے بھتیجے کو تالا اور تجوری کھولنے کی ساری ترکیبیں بہترین مجرموں کو بلا کر اور کثیر معاوضہ ادا کر کے سکھا دی تھیں۔ لوہے کے جنگلے والے تالے کو کھولنا کوئی مشکل نہ ہوگا۔

اور واقعی لوہے کے جنگلے کے تالے کو کھولنا مشکل ثابت نہ ہوا جنگلا کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ پھر جنگلے کو برابر پھیلا دیا اور جنگلے سے باہر ہاتھ بڑھا کر پھر تالہ لگا دیا۔ اُسے شبہ تھا کہیں راتوں کو ٹھاکر سنگھ اٹھ کر اس تالے کو بھی کھینچ کر نہ دیکھتا ہو۔ اب کوئی ڈر نہیں ہے۔ تالہ دوبارہ لگ چکا تھا۔

وہ جب اُوپر سے نقب لگا کے آئیگا، اسے پھر سے ہاتھ بڑھا کر کھول دے گا۔ اور جنگلے کے باہر پھر سے تالہ لگا کر اپنے کمرے میں چلا جائے گا۔

سیڑھیوں پر گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دبے پاؤں بے آواز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اوپر کوریڈور میں پہونچ کر اس نے دو منٹ کے لئے رک کر اپنی سانس کو درست کیا۔ پھر پانچ قدم چل کر اس نے پوجا کے کمرے کے دروازہ پر ہاتھ ڈالا۔ دروازے پر تالا تھا۔

پنسل ٹارچ کی مدد سے اس نے تالے کے سوراخ پر روشنی ڈالی اور جھولے سے ایک ٹیڑھا تار نکال کر اس کی مدد سے اس نے تالا کھول لیا۔ وہ لکڑی کے دروازے کی چرخ چوں سے بہت ڈرتا تھا اس لئے تالا کھولنے کے بعد دروازہ کھولنے میں اسے کئی منٹ لگ گئے۔ اس قدر احتیاط سے اس نے دروازہ کھولا تھا کہ ذرا بھی آواز نہ ہوئی۔ پھر صرف اتنا ہی دروازہ کھولا تھا جس میں اس کا جسم سائیڈ سے اندر جا سکے۔

دروازہ کے اندر جاتے ہی اس نے چٹخنی چڑھا دی۔

یکا یک اس نے کمرے کے اندر ایک آہٹ سی سنی اور وہ وہیں منجمد ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد اس نے سوچا۔ بلی ہو گی۔

ایک لمبے خاموش وقفے کے بعد جو اسے صدیوں کی طرح طویل محسوس ہوا۔ اس نے اپنے جھولے سے ایک بڑی ٹارچ نکالی جس کے روشنی کے دائرے کو وہ ایک گھومنے والے سوئچ سے کنٹرول کر سکتا تھا۔

روشنی کا دائرہ کمرے میں گھومنے لگا۔ ایک کونے میں بہت سے ٹرنک پڑے تھے۔ لکڑی کی پانچ چھ الماریاں دیوار سے لگی ہوئی تھیں۔ ایک تجوری تھی بلکہ

یوں کہنا چاہیے کہ دیوار کے اندر ہی وہ تجوری بنی ہوئی تھی۔ بہرکرے کا ایک حصہ خالی تھا۔ پھر دروازہ تھا پھر ایک کونے میں چاندی کا چھتر نظر آیا۔ اور اس کے نیچے بھگوان رام کی مورتی۔ سنگِ مرمر کی بنی ہوئی۔ قریب میں پوجا کا سامان۔ ایک پرانا گھسا ہوا غالیچہ۔ مورتی کے پیچھے کافی اندھیرا تھا۔ یکایک اس کو مورتی کے پیچھے ایک سایہ نظر آیا۔ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ دلیپ نے مورتی کے پیچھے جا کر جو ٹارچ روشن کی تو اس نے دیکھا۔ دیوار سے لگی دونوں ہاتھ پھیلائے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

عمر مشکل سے بیس برس کی ہوگی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ لانبی گردن۔ چمپئی رنگ اور بسنتی بلاؤز کے پھٹے ہوئے کالروں سے جھانکتی ہوئی سینے کی گولائیوں کے زیر و بم۔ اس نے سلیٹی رنگ کی ایک جینز پہن رکھی تھی۔

"کون ہو تم۔؟" دلیپ نے اس سے سرگوشی میں پوچھا۔

"اور تم کون ہو۔؟" لڑکی نے جواب دیا۔ وہ بھی سرگوشی میں بولی تھی۔ آگے چل کر جتنی بھی گفتگو ہوئی سرگوشی میں ہوئی۔

"تم یہاں کیا کرنے آئی ہو۔؟"

"جو تم کرنے آئے ہو۔"

"تم کیا ڈھونڈھ رہی ہو۔؟"

"جو تم ڈھونڈھ رہے ہو۔"

"تمہیں کچھ ملا۔"

"میں جو تلاش کرنے آئی تھی وہ مجھے مل گیا۔"

"کیا۔؟"

مگر اس لمحے میں اسے اپنا سوال بیکار معلوم ہوا کیونکہ اس کے ٹارچ کی روشنی لڑکی کے بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے سونے کے ایک پترے پر پڑ رہی تھی۔ اسی ایک لمحہ میں دلیپ نے پہچان لیا۔ یہ وہی سونے کے پترے کا ٹکڑا تھا جس کی تلاش میں وہ نینی تال آیا تھا۔

یہ سب ایک لمحہ میں ہوگیا۔ دوسرے لمحہ میں دلیپ نے غرا کر لڑکی کی طرف جست لگائی۔ دوسری طرف سے لڑکی نے بھی اس کے داؤ سے بچ نکلنے کی کوشش کی ایک لمحے کے لئے وہ لڑکی اس کے بازوؤں میں تھی۔ دوسرے لمحہ میں وہ اس کی گرفت سے یوں پھسل گئی جیسے کبھی کبھی مکھن کی ڈلی دو انگلیوں میں سے پھسل جاتی ہے۔

لڑکی نے دو تین قلابازیاں بھریں اور اب دلیپ نے دیکھا کہ وہ کمرے کے عقب میں ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے کود گئی اور اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ دلیپ بھی بھاگتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ معلوم ہوا لڑکی کودی نہیں تھی۔ اس نے چھلانگ لگائی تھی اور چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے مضبوطی سے ایک رسّے کو پکڑ لیا تھا۔ جو ابھی تک کھڑکی سے لگا جھول رہا تھا۔ کسی پس و پیش کے بغیر دلیپ بھی اسی کھڑکی سے رسّے کے سہارے کود گیا۔ اور پھسلتے ہوئے نیچے پہونچ گیا۔

مگر لڑکی چھلاوے کی طرح عقب کے جنگل میں غائب ہوچکی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی سے کافی دیر تک جنگل میں اِدھر اُدھر دیکھا مگر اُسے ناکامی ہوئی۔

گھر میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ کتّے بھونک رہے تھے۔ ملازم جاگ رہے تھے۔ اب واپس جانا بیکار تھا۔ اس کے پاس ایک تھیلا تھا اور فائل۔ چند کپڑے نوٹوں کی گڈیاں۔ اسٹیٹ بنک کے چیک۔ نقب زندگی کا سامان۔ ایک رامپوری چاقو۔ باقی

سامان وہ اڈے پر رکھ آیا تھا۔

اب واقعی واپس جانا بیکار ہے۔ سونے کا تیرا وہ لڑکی لے گئی۔ صبح پولیس آئے گی اور تفتیش شروع کرے گی۔ کرتی رہے۔ اب اس کے لئے واپس جانا بیکار ہے۔ حالانکہ ابھی اس کا کچھ سامان کمرے میں ہے مگر اب واپس جانا خطرے سے خالی نہیں۔

وہ رات کی تاریکی میں ایک پگڈنڈی کو پکڑ کر نیچے تلی تال کی طرف روانہ ہو گیا۔ صبح پولیس آنے سے پہلے وہ یہاں سے جا چکا ہو گا۔

نینی تال سے وہ کاٹھ گودام آیا۔ کاٹھ گودام سے چھوٹی لین کی گاڑی پکڑ کر بریلی پہونچا۔ وہاں سے براستہ علی گڑھ ہوتا ہوا دہلی آیا۔ دہلی سے دون ایکسپریس پکڑ کر دہرہ دون پہونچ گیا اور ہوٹل کاسل رے میں قیام کیا۔

دہلی میں اس نے تین روز قیام کیا۔ ایک ٹرنک خریدا۔ اس میں پتلون اور قمیص کے دو جوڑے رکھے۔ سستے والے۔ تقریباً نوکر پیشہ لوگوں جیسے۔ چند جنتریاں خریدیں اور ایک پنچانگ۔ دو دن ہوٹل میں بند ہو کر ان کا مطالعہ کرتا رہا۔

پھر "دون ایکسپریس" سے دہرادون آگیا۔ اب کاسل رے ہوٹل کی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔

اس کا اگلا نشانہ مسوری اور دہرہ دون کے بیچ میں کہیں پر تھا۔ فائل میں ایڈریس بھی تھا اور تصویر بھی۔

مسوری، جانے والی ٹیکسی کے بجائے وہ دوسرے دن ایک بس میں سوار ہوا جو مسوری کے لئے تیار تھی۔ کلینر نے اس کا سامان اوپر لاری کی چھت پر رکھا۔ جھولا دلیپ کے ساتھ رہا۔ بس کل اتنا ہی سامان اس کے ساتھ تھا۔ دلیپ اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ سفر میں جتنا سامان کم رہے اچھا ہوتا ہے۔

چھپڑیا کے مقام پر وہ لاری سے اتر گیا اور اپنا ٹرنک اتروالیا۔ اس نے یہاں تک کا ہی ٹکٹ لیا تھا۔

لاری سے اتر کر اس نے دیہاتیوں کی طرح ٹرنک اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور بھڑکلی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ راستہ پر پیچ تھا۔ مگر خوشگوار ہرے بھرے درخت چشمے، ندی نالے، پہاڑیاں، چرواہے، خوب صورت عورتیں، ہنسی، گیت، قہقہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے بھی مسائل ہیں۔ مگر فطرت جو سکون یہاں بخشتی ہے وہ ہم شہر والوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔

شام ہوتے ہوتے وہ بھڑکلی گاؤں کے قریب پہونچ گیا جو راستیا ندی کو پار کر کے اوپر ایک اونچی چڑھائی چڑھ کر نظر آیا تھا۔ یہ گاؤں ایک خوبصورت ٹیکری پہ آباد تھا اور اس کے پیچھے چیڑھوں کا گھنا جنگل تھا۔

راستہ میں گاؤں سے ذرا باہر اسے عورتوں کا ایک جھنڈ ایک موٹی دھار والے جھرنے کے قریب شام کے لئے پانی بھرتا نظر آیا۔

اس نے ایک بوڑھی عورت سے پوچھا۔ "موسی، نندولارے کا گھر کدھر ہے"

نندولارے کا نام آتے ہی سب لڑکیاں ہنس پڑیں۔

دلیپ کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔؟

بوڑھی عورت نے غصہ بھری نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔
وہ سب سہم گئیں۔
"تندولا رے۔؟ وہ جیو کشی۔؟" بوڑھی عورت نے پوچھا۔
"ہاں، ہاں۔" دلیپ نے زور سے سر ہلایا۔
"وہی نا۔ سانولا سا۔ ناٹا سا۔ بھاری ڈیل ڈول کا۔ دھوتی پہنتا ہے۔؟"
موسی نے پوری جانکاری چاہی۔
"ہاں، ہاں۔ وہی، وہی۔"
"وہی جس کی بیوی مر چکی ہے۔"
"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"
"تو اب تم کو بتاتی ہوں۔ اس موئے کو چھ سال ہوئے ہم نے گاؤں سے نکال دیا ہے۔ اور جات باہر کر دیا ہے۔"
"کیوں۔؟ کیوں۔؟" دلیپ کا دل بیٹھنے لگا۔
"گاؤں کی چھوکریوں کو چھیڑتا تھا۔ اور پنچایت کے سزا دینے پر بھی باز نہیں آیا۔ اس لئے ہم نے اسے گاؤں سے باہر نکال دیا۔"
"تو اب وہ کیا اس گاؤں میں نہیں رہتا۔؟"
"نہیں۔ یہاں سے کوئی ڈیڑھ میل اوپر جنگل میں اس نے اپنا مکان بنا لیا ہے۔ پیسہ بہت ہے اس کے پاس مگر اکیلا رہتا ہے اور سب کام اس کو خود کرنا پڑتا ہے ہمارے گاؤں سے تو کوئی جاتا نہیں اس کے یہاں کام کرنے چاہے مہینے میں بیس روپے پگار کیوں نہ دے۔"

اب دلیپ کی سمجھ میں آیا۔ لڑکیاں نندولالے کے نام پر کیوں ہنس رہی تھیں۔
"تم کون ہو اس کے ۔ ؟" ایک جوان اور کسی قدر دلیر لڑکی نے اس سے
پوچھ ہی لیا۔
لڑکی نے سوال کرنے سے پہلے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ لیا تھا۔ اور جو کچھ
اس نے دیکھا تھا وہ شاید اسے پسند بھی آیا تھا۔
"میں اس کی موسی کا لڑکا ہوں۔" دلیپ نے جھوٹ بولا۔
بوڑھی عورت نے اس جوان لڑکی کی طرف ناپسندیدہ نگاہوں سے
دیکھ کر کہا۔ "تمہیں کیا وہ کس کی موسی کا لڑکا ہے۔" پلٹ کر دلیپ سے بولی۔
"یہ پگڈنڈی پکڑ کر سیدھے اوپر جنگل میں چلے جاؤ۔ ایک کوس کے بعد نیلے
پتھر کا جو مکان تم کو دکھائی دے گا وہ اسی منحوس کا ہے۔"
"جاتا ہوں مگر پہلے پانی تو پی لوں۔"
اسی دلیر لڑکی نے پیتل کے ایک لوٹے سے اسے پانی پلایا۔ دلیپ نے آہستہ
سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔ ؟"
وہ ہوا سے بھی ہلکی سرگوشی میں بولی۔ "میں بھاماں ہوں۔ گاؤں میں اس نام
کی کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے۔"
"پھر تو میں معلوم کر لوں گا۔"
"کیا بات ہو رہی ہے۔ ؟" وہ بوڑھی عورت بھڑک کر بولی۔
"کچھ نہیں چاچی۔ یہ چھوکرا کہہ رہا ہے۔ وقت بہت ہو گیا ہے شام ہو گئی ہے۔
جانے رات کے سمے کب جیوتشی جی کے گھر پہونچوں گا اس لئے یہ آج رات گاؤں ہی

میں رہنا چاہتا ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ بوڑھی عورت کڑک کر بولی۔ "اسے بول دو۔ ہم نے نند دلارے کو جات باہر کر رکھا ہے۔ اس کا کوئی رشتہ دار بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔"

وہ لڑکی تیز لہجہ میں دلیپ سے بولی۔ "سنتے ہو۔ یہاں تم بالکل بھی نہیں رہ سکتے۔!"

اس کا لہجہ تیز تھا مگر آواز مصنوعی تھی۔ بوڑھی چاچی کی نقل کرتے ہوئے بول رہی تھی۔

ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بوڑھی عورت دیر تک غصہ میں بڑبڑاتی رہی۔ اور نند دلارے اور اس کے موسی کے لڑکے کو گالیاں دیتی رہی۔

دلیپ مسکرا کر وہاں سے چل دیا۔

بھاماں...... بھاماں...... بھاماں کے دلکش خدوخال اس کی آنکھوں میں اُبھرنے لگے۔ بھاماں اسے ایسی لڑکی معلوم ہوئی جو مرد کا شعور رکھتی ہو۔ جیسی آنا تھی مگر آنا عورت تھی اور یہ لڑکی۔ خود آنا دلیپ کے لئے اس کا پہلا جنسی تجربہ تھی۔

اب وہ پہاڑی پگڈنڈی چڑھتے چڑھتے بھاماں کے لئے بے قرار ہونے لگا۔ پھر اُسے اپنے کام کا خیال آیا تو وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک موڑ کاٹ کر یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے نند دلارے کا مکان اُبھرا۔

صرف ایک کھڑکی سے روشنی جھلملا رہی تھی۔ اس روشنی میں دلیپ نے اپنی گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ ممکن ہے جیوتشی جی سو چکے ہوں۔

دلیپ نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

پہلے تو کوئی آواز نہیں آئی۔ مسلسل پانچ سات منٹ کھٹکھٹانے سے دروازے کے اوپر سلاخوں والی کھڑکی میں سے ایک گھٹے ہوئے سر والا لمبوترہ چہرہ نمودار ہوا۔

"کون ہو تم۔؟ کہاں سے آئے ہو۔؟ کیا چاہتے ہو۔؟"

"تمہاری رگھی موسی کا لڑکا ہوں۔ نند دلارے جی۔ بریلی سے آرہا ہوں۔" دلیپ بولا۔

"بریلی کے کس محلے سے۔؟" نند دلارے نے شبہات سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"نیپڈوری محلّے سے۔" (فائل میں یہی لکھا تھا۔)

"رگھی موسی نے بھیجا ہے۔؟" نند دلارے کا شبہ کسی قدر کم ہونے لگا۔

"دروازہ کھولو تو سب بتاؤں گا۔ یہاں باہر کھڑا کھڑا تو سردی سے اکڑ جاؤں گا۔"

کچھ دیر لالٹین کی روشنی دلیپ کے چہرے پر پڑتی رہی۔ دلیپ بھی آنکھیں آنکھیں جھپکائے بغیر سیدھے انداز سے سر اٹھائے جیوتشی جی کی جانب دیکھتا رہا۔

پھر لالٹین سلاخوں کے پیچھے سے ہٹ گئی۔ پھر دروازے کی جھری میں سے روشنی اسے اپنے قریب آتے ہوئے دکھائی دینے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد نند دلارے نے ڈیوڑھی کا کواڑ کھول کر کہا۔

"اندر آ جاؤ۔"

دلیپ سر پر ٹرنک اٹھائے اندر ڈیوڑھی کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ ڈیوڑھی کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک دالان سے گزر کر پھر ایک دروازہ نظر آیا۔ جوتشی جی نے اپنی دھوتی میں جھولتے ہوئے چابی کے گچھے میں سے ایک چابی لگا کر یہ دروازہ بھی کھولا۔ دلیپ نے اپنے ذہن میں نوٹ کر لیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ۔ دالان، پھر دوسرا دروازہ۔ گویا ڈبل احتیاط۔

اس دروازے سے اندر گھستے ہی ایک اور دالان تھا۔ مگر پہلے دالان سے چھوٹا۔ اس دالان کے دونوں طرف دو دو کمرے تھے۔ بائیں طرف دو کمرے اور دائیں طرف بھی دو کمرے۔ بیچ میں یہ چھوٹا سا دالان کوٹھری نما، اس کوٹھری سے گزر کر گیا ہے۔ وہ اس وقت نہیں دیکھ سکا کیونکہ نند دلارے نے کسی دوسری چابی سے بائیں طرف کا پہلا کمرہ اس کے لئے کھول دیا اور بولا۔

"رات کو ادھر پڑے رہو۔ صبح بات کریں گے۔"

صبح اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کے دیکھا تو اسے عجیب نظارہ دکھائی دیا۔ گھر کے اندر ایک وسیع آنگن کی چار دیواری میں پورب کی طرف ایک چھوٹا سا شوالہ تھا جس کے عقب میں جنگلوں سے بھرا ہوا کوہستانی سلسلہ بہت اچھا لگتا تھا۔ شوالے میں نند دلارے شوا استتی میں مصروف تھا۔

سارے آنگن میں ہرا سبزہ اگا تھا۔ جس کے اندر شوالے تک جانے کے لئے پتھر کی پگڈنڈی تھی۔

دلیپ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اندر کے آنگن کی طرف اس نے دیکھا۔ اس کا رات کا اندازہ غلط تھا۔ اس مکان میں چار کمرے نہیں تھے۔ چھ، سات تھے۔ اندھ کا

دالان تین طرف پھیلا ہوا تھا۔ دائیں طرف کا ونگ چھپتے ہوئے دالان کے اندر غالباً چار کمروں پر مشتمل تھا۔

رات کو اس نے اسی لئے غلط اندازہ لگایا کہ بائیں طرف کے ونگ میں جدھر اُسے رہنے کو جگہ ملی تھی اُدھر دو ہی کمرے تھے۔

جب نند دلارے پوجا سے فارغ ہوا تو اس نے دلیپ کو دالان کے ایک چوبی ستون سے لگا کھڑا پایا۔

نند دلارے نے پوچھا۔ "اب اٹھے ہو۔؟"

"رات بہت تھکا ہوا تھا۔ دیر میں آنکھ کھلی۔"

"پیارے کہاں ہے۔؟"

"ٹرج میں۔"

"اور جگن۔؟"

"نیپال چلا گیا۔"

یہ رکھی ماسی کے دونوں بیٹوں کی طرف اشارہ تھا۔ مگر دلیپ تو بالکل تیار ہو کے آیا تھا۔

"رکھی ماسی کیسی ہیں۔؟"

اپنی دانست میں جیو نشی جی نے بڑی چالاکی کا سوال کیا تھا۔ کیونکہ فائل میں لکھا تھا کہ نند دلارے جی کو رکھی موسی کے فوت ہو جانے کی اطلاع ہے۔

دلیپ نے چونک کر بڑی جسرت کا اظہار کیا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میری ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کا سدا گڑھ سے خط آیا تھا۔"

"اوہ۔ ! ٹھیک، ٹھیک۔ !" نند دلارے نے سر ہلایا۔ بچہ مزدور سے ہنس کر اور دلیپ کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بولا۔ "میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم سچ مچ میری موسی کے لڑکے آنند ہو۔"

"میں آنند نہیں ہوں۔ آنند تو بریلی میں پان کی ایک دوکان پر بیٹھتا ہے۔ میں اپنے بھائیوں میں ...... سب سے چھوٹا ہوں۔ دیا شنکر میرا نام ہے۔"

"اچھا تم ہی ہو شنکر۔ ؟" نند دلارے مسکرا کر بولا۔ "میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔ کہو تمہیں میرا پتہ کیسے معلوم ہوا۔ ؟"

"پہلے تو میں سدر راہ گڑھ گیا۔ وہاں سے جھالسنی۔ جھالسنی سے شام گڑھ۔ شام گڑھ سے دلی گیا جہاں دریا گنج کے پچھواڑے، انصاری روڈ پر آپ کا گھر تھا۔ وہاں سے دہرہ دون کا پتہ چلا۔ دہرہ دون سے کھڑکلی گاؤں کا سراغ ملا......"

"تو یہاں میرے پاس کیوں آئے ہو۔ ؟"

"میں جیوتش سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جیوتش۔ !"

"ہاں۔ میری ماں نے بتایا تھا آپ بہت بڑے جیوتشی ہیں۔ اور جہاں جہاں آپ کی تلاش میں گیا وہاں ہر جگہ آپ کی بہت تعریف سننے میں آئی۔ آپ سے جیوتش سیکھوں گا۔"

نند دلارے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر بولا

"جیوتش میں کیا رکھا ہے۔ ؟ اپنے بھائی کی طرح فوج میں جاؤ۔ تمہارا ڈیل ڈول بہت اچھا ہے۔ فوج میں نام پاؤ گے۔"

"مگر میں جیوتش میں نام پانا چاہتا ہوں۔"

"جیوتش بہت مشکل ودیا ہے۔ کئی سال لگ جائیں گے۔"

"آپ کے چرنوں میں ساری عمر گزار دوں گا۔" دلیپ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"مگر یہ ودیا حاصل کر کے رہوں گا۔"

"پر میں نے تو اب دنیا چھوڑ دی ہے۔"

"دنیا چھوڑ دینے سے ودیا تو نہیں چھوٹ جاتی۔"

نند دلارے نے ہنس کر کہا۔ "لگن والے لڑکے معلوم ہوتے ہو۔ اچھا جاؤ۔ باہر جنگل ہو آؤ۔ پھر واپس آکر باؤلی میں اشنان کر کے مجھ سے پہلا منتر لو۔ باؤلی تم نے دیکھی ہے۔؟"

دلیپ نے انکار میں سر ہلایا۔

نند دلارے جی اسے بائیں دالان کے آخری سرے پر لے گئے۔ ادھر کا منظر اخروٹوں کے ایک جھنڈ میں چھپ گیا تھا۔ جب وہ دونوں جھنڈ سے آگے نکلے تو انہیں ایک پکی باؤلی نظر آئی۔ پکی اور پرانی سی۔

دلیپ نے پوچھا۔ "یہ باؤلی آپ نے بنوائی ہے۔؟"

"نہیں بیٹے۔ یہ باؤلی اور یہ شوالہ یہاں بہت ٹوٹی حالت میں پہلے سے موجود تھے۔ ویران جگہ دیکھ کر یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ میں نے یہ جگہ سرکار سے خرید کر یہاں یہ گھر بنوالیا ہے۔"

"دنیا سے الگ۔؟"

"ہاں، بہت نام کما لیا۔ پیسہ بھی زندگی بھر کے لئے کافی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔

ضرورتیں زیادہ نہیں پالیں۔ اپنے آپ میں مست رہتا ہوں...... دھوتی لائے ہو۔"

"ہاں، لایا تو ہوں۔"

"تو نہا دھو کے تیار ہو جاؤ۔"

* * * *

دلیپ اپنا تھیلا اور لوٹا لے کے جنگل کو نکل گیا۔ تھیلے میں سے کچھ نقب زنی کی چیزیں نکال کر اس نے ایک گڑھا کھود کے دبا دیں۔ اور زمین کو ہموار کر دیا۔ اور جگہ ذہن میں محفوظ کر لی۔ یہ جنگلی کیلوں کا ایک جھنڈ تھا۔

پھر باؤلی میں نہا کر اس نے کپڑے بدلے۔ دھوتی پہن کر انگوچھا کاندھے پر رکھ کر اس نے جیوتشی جی کو پرنام کیا۔ اور ان کے چرنوں میں جھک کر انہیں گیارہ روپئے دکشنا کے لئے دیئے۔

نند دلارے نے آسے آسیس دی اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ دلیپ نے کچھ جنتریاں اور پنچانگ نکالیں جنہیں اس نے دلّی سے خریدا تھا۔ نند دلارے نے اک دم جھڑک کر پنچانگ اور جنتریوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

"ان جنتریوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ جیوتش ستاروں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ تو سدھی ہے سدھی، سدھی کے ہاتھ من میں بجلی کا سا پرکاش ہوتا ہے۔ اور گیان دھیانی اس پرکاش میں سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ کل کیا ہوا تھا۔ آج کیا ہو رہا ہے۔ کل کیا ہونے والا ہے سب سینما کی تصویر کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ اس کے لئے سدھی کی ضرورت ہے۔ نکشتروں

کو بھول جاؤ۔"

"مگر یہ سدھی کیسے ہوگی۔؟"

"پہلا منتر دیتا ہوں۔ اسے آج دن میں پانچ ہزار بار پڑھو۔ اکیلے میں شوالے میں۔ شو بھگوان کے سامنے۔ چوکڑی مار کر پڑھو۔"

"انڈو منڈو شنڈو۔
پالے بھائی کالے بھائی سالے بھائی
شانتی بھائی کانتی بھائی مانتی بھائی
ثور حمل درک
یبن مقفن کرک
بول شانتی بول شانتی بول شانتی
مانتی مانتی مانتی"

نند دلارے نے اسے یہ منتر اپنے سامنے پانچ دفعہ پڑھوایا۔

پانچویں دفعہ دلیپ اسے پڑھ کر بولا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔؟"

نند دلارے زور سے ہنسا۔

"یہ بکواس نہیں ہے۔ تمہیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ شبدوں کے اچارن سے بار بار اُچارن سے ایک گتی پیدا ہوتی ہے۔ اس گتی کو بڑھاتے رہنے سے ایک دشا ایسی آتی ہے جب وہ گتی سدھ ہو جاتی ہے۔ تم نے سنا ہوگا تان سین دیپک راگ سے بجھے ہوئے چراغ جلا دیتے تھے اور ہمارے پرانے رشی منی ملہار گا کر بارش برسا دیتے تھے۔

"جی ہاں، سنا تو ہے پر کبھی یقین نہیں آیا۔"

"اگر چیلا گرو کی بات پر یقین نہیں کریگا تو کیا وہ خاک سدھ کرے گا۔ آنکھیں بند کرکے جیسا ہم کہتے ہیں کرتے جاؤ۔ چار چھ سال میں اس گتی کو پا لوگے۔ بولو۔

انڈو منڈو شنڈو۔"

دلیپ نے بڑی عاجزی سے دہرایا۔ "انڈو۔ منڈو۔ شنڈو.....!"
پھر دل ہی دل میں دہرایا۔ "تیری ماں کو لے جائیں چنڈو۔"

* * *

شوالے میں دو ہزار بار اس منتر کو پڑھ کر دلیپ کو نیند سی آنے لگی۔ نند دلارے نے اسے ٹھوکا دیا۔ "اٹھو ــــ رسوئی میں جا کے کھانا تیار کرو۔ پھر کھانا مجھے کھلا کے، خود کھا کے اور برتن دھو کے جنگل جاؤ اور شام کے لئے لکڑیوں کا بوجھ کاٹ لاؤ۔"

"بہت اچھا گورو جی۔" دلیپ شوالے سے باہر آگیا۔

رسوئی دائیں ونگ میں تھی اور سب سے آخر میں، شوالے کے قریب۔ اس کے چاچا نے دلیپ کو معمولی سا کھانا پکانا بھی سکھا دیا تھا۔ یعنی دال، بھاجی سبزی، چاول، روٹی۔ مگر دلیپ کا دل اس میں نہیں لگا تھا۔

نند دلارے نے کھانے کا ایک لقمہ لے کر منہ بنایا۔

"یہ کیا بنایا ہے تم نے۔" اُس نے پوچھا۔

دلیپ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "بس ایسا ہی کچا پکا تیار کر لیتا ہوں۔ گورو جی من کھانا پکانے میں نہیں لگتا۔"

"من لگانا پڑیگا نہیں تو تمہارا سامان اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔" تندلا رے اپنا لہجہ بدل کر بولا۔

"تمہیں سکھا دیں گے۔ لگتا ہے جیوتش ودیا کی سدھی کے ساتھ ساتھ تمہیں کھانے کی سدھی بھی حاصل کرنی پڑے گی۔"

برتن دھوکر اور انہیں قرینے سے سجا کر جب دلیپ رسوئی سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ جیوتشی جی ایک ہاتھ میں کلہاڑا اور دوسرے ہاتھ میں رسی لے کر کھڑے ہیں۔

تندلا رے نے رسی دلیپ کے ہاتھ میں دی اور کلہاڑا اس کے کندھے پہ رکھ کر کہا۔ "اب جاؤ، جنگل سے لکڑی کاٹ کے لاؤ۔ اچھا بڑا گٹھا لانا۔ نہیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

دلیپ نے پوری دوپہرا اور سہ پہر جنگل میں کاٹی۔ کافی گھنا جنگل تھا۔ مگر اسے اس جنگل میں چند بندروں اور دو ایک خرگوشوں کے علاوہ کوئی جنگلی جانور نہیں ملا۔ پھر وہ ادھر اُدھر گھوم کر جنگل میں پڑی خشک شاخیں اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اکٹھی کرتا گیا۔ لیکن جب ان سے بھی بڑا گٹھا نہ بن سکا تو اس نے کنیل کے ایک سوکھے پیڑ پر اپنا کلہاڑا آزمایا اور مزا لینے کی خاطر جیوتشی جی کا منتر بھی پڑھتا گیا۔

"انڈو منڈو شنڈو
بالے بھائی کالے بھائی سالے بھائی
شانتی بھائی کانتی بھائی ماتی بھائی
ثور حمل دلک
بین منتھن کرک
بول شانتی بول شانتی بول شانتی
ماتی ماتی ماتی۔

اب گٹھا بھی بڑا بن گیا تھا اور اسے یہ منتر بھی ازبر ہو گیا تھا۔ یہ جیوتشی نہایت ہی لیچڑ اور چیپچڑ آدمی ہے۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اسے یہاں آ کر سب کام کرنا پڑے گا۔ مگر اتنا کام کرنا پڑے گا۔ ؛ اب تو پھنس گئے تھے۔ یہاں کام تو کرنا ہی پڑیگا۔ ایک گھامڑ چیلے کی سی ایکٹنگ کرنی پڑے گی۔ جانے کتنے دن۔ ؟

"اونہہ۔" کہہ کر دیپ نے گٹھا سر پر اٹھالیا اور واپس جیوتشی کے گھر کی طرف چل دیا۔

جب گھر کے اندر رسوئی کے قریب اس نے گٹھا ٹپک دیا تو کیا دیکھتا ہے کہ رسوئی میں آگ روشن ہے۔ اور چولہے کے قریب وہی لڑکی جو اسے ٹھاکر سنگھ کے پوجا کے کمرے میں ملی تھی۔ روٹی بیل کر توے پر ڈالتی جا رہی ہے اور اس کا چہرہ دہکتی ہوئی آگ میں روشن ہو کر گلنار ہوا اٹھا ہے۔

○

دلیپ کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ یہاں بھی آن پہنچی۔ ٹھاکر سنگھ راوت کے واقعے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی ذاتی طور پر یا کسی گینگ کے ایما پر سونے کی کان کا سراغ نکالنے کے لئے اسی طرح نکلی ہے جس طرح وہ نکلا ہے۔ راؤ کے یہاں جس ہوشیاری اور چالاکی کا اس لڑکی نے ثبوت دیا تھا۔ اس کی بھی وہ دل ہی دل میں تعریف کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اسے اس امر کا غصہ بھی تھا کہ وہ اس لڑکی کے مقابلے میں اس قدر گاؤدی کیوں ثابت ہوا۔ اب جو اس نے اس لڑکی کو پھر یہاں دیکھا تو ایک احساس خوشی کا بھی تھا۔ اب اس لڑکی سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔

مگر لڑکی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ بدستور خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔ دو تین بار دلیپ نے گفتگو کرنا چاہی مگر لڑکی بالکل خاموش

رہی اور ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے دلیپ کی باتیں سنی ہی نہیں۔

لاچار ہو کر دلیپ رسوئی سے مڑا۔ رسوئی سے ملحق کمرے میں ایک دیوار گیر آہنی الماری کے دونوں پٹ کھولے۔ نند دلارے اسے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا نظر آیا۔ پھر اس نے باری باری مختلف چابیاں لگا کر الماری کے دونوں پٹ کئے۔ دلیپ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اور واپس رسوئی کی طرف الٹے پاؤں گھوم گیا۔

جب نند دلارے کمرہ بند کر کے اور اسے مقفل کر کے باہر دالان میں آیا تو اس نے دلیپ کو رسوئی کے باہر لکڑی کے گٹھے کے قریب کھڑے دیکھا۔

"لکڑیاں لے آئے۔؟" نند دلارے نے پوچھا۔

"ہاں گورو جی۔"

نند دلارے نے لکڑی کا گٹھا دیکھا۔ کافی بڑا اور وزنی تھا۔ نند دلارے بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے چیلے کی پیٹھ ٹھونکی پھر بولا۔

"صبح کتنی بار منتر کا جاپ کیا۔؟"

"دو ہزار بار۔"

"ابھی تین ہزار باقی ہے۔ چلو میرے ساتھ باؤلی پر چلو۔ اشنان کر کے شوالے جائیں گے۔ میں شیو کی پوجا کروں گا۔ تم جاپ کرنا۔ پھر کھانا کھا لیں گے۔"

دلیپ بڑی عاجزی سے بولا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ پہلے کھانا کھا لیں بعد میں جاپ۔"

"ہشت۔!" گورو جی نے غصہ سے اس کی طرف گھورا۔

دلیپ مزید کچھ کہے بغیر اپنے گورو کے ساتھ باؤلی کی سمت چل دیا۔ باؤلی کی طرف جاتے جاتے دلیپ نے پوچھا۔

"یہ کون لڑکی ہے۔؟ صبح تو یہاں نہیں تھی۔"

"دوپہر میں آئی ہے۔"

"مگر ہے کون۔؟ کھانا پکانے کے لئے رکھی ہے۔؟"

"نہیں۔! مگر جتنے دن رہے گی کھانا پکائے گی۔ کیونکہ تم کھانے میں الدم گھاس کاٹتے ہو۔ تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کوئی جانور بھی نہیں کھا سکتا۔"

"گورو جی۔۔۔! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"جواب کیا دوں۔ میں بھی نہیں جانتا کون ہے۔ مگر کوئی مصیبت کی ماری معلوم ہوتی ہے۔ نام بتاتی ہے نربدا۔ ترکل گاؤں کی ہے۔ یہاں سے کوئی پچاس کوس کے فاصلے پر ہے۔ جب پیدا ہوئی تو اس کی ماں مرگئی۔ جب اس کی منگنی ہوئی تو اس کا باپ مرگیا۔ شادی ہوئی تو گھر والا مرگیا۔ گاؤں والوں نے سمجھا یہ چنڈالی ہے۔ یا کوئی منحوس جادوگرنی ہے۔ مائیکے والے اور سسرال والے اور گاؤں والے سب پنچایت کرنے بیٹھے اور پنچایت نے فیصلہ دیا کہ اسے گاؤں سے باہر نکال دیا جائے۔ جب سے یہ ٹھوکریں کھاتی کھاتی یہاں آئی ہے۔ کہتی ہے مجھ پر کسی بدروح کا اثر ہے۔ اسے نکال دو۔ سو میں نکال سکتا ہوں اور دھیرے دھیرے نکال دوں گا۔ مگر یہ کوئی بہت ہی طاقت ور بدروح معلوم ہوتی ہے اسے نکالتے نکالتے سال چھ مہینے تو لگ جائیں گے۔"

دلیپ سمجھ گیا کہ لڑکی کی موہنی، اس کے حسن کی دلکشی گورو جی کو بھا گئی ہے۔ اسی لئے سال چھ مہینے کی بات کر رہے ہیں۔

دلیپ بولا۔ "بریلی میں ایک عامل رہتا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں سُنا ہے وہ دو دن میں بدروح کا سایہ دور کر دیتا ہے۔ اسے بریلی بھیج دو۔"

گورو جی نے اسے غضبناک نظروں سے دیکھا بولے۔ "تو کیا جانے سفلی یا روحی عمل کی باتیں۔ مجھ سے بڑا عامل اس دنیا میں کون ہوگا۔ سات جنات اپنے قبضے میں ہیں۔ ساتوں ولایتوں کا حال بتا سکتا ہوں، چٹکی میں۔ ایسے ہی سہیل گڑھ کے نواب پرویز نے مجھے زندگی بھر نوکر نہیں رکھا۔ اور مرتے وقت اتنا پیسہ دے گئے جو میرے جیون بھر کے لئے کافی ہے۔"

دلیپ چپ ہو گیا مگر اسے اتنا یقین ہو گیا کہ وہ ٹھیک جگہ پر پہنچا تھا۔!

راوت کے یہاں دلیپ نے اس لڑکی کو بیلا ڈزا اور جینز میں دیکھا تھا۔ یہاں وہ ایک معمولی کاٹن کی ساری میں ملبوس ایک مظلوم لڑکی نظر آئی۔ اس کے چہرے کی مظلومیت نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ اب وہ سر جھکائے گورو جی اور ان کے چیلے کے لئے کیلے کے پتوں پر کھانا پروس رہی تھی۔ اور گورو جی نہال ہو کر اس کے تیار کئے ہوئے کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔ دلیپ بالکل چپ رہا۔ اسے یقین تھا کہ گورو جی اس کی تعریف پسند نہیں کریں گے کھانا کھاتے کھاتے وہ ایسی گرسنہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھتے جاتے جیسے کھانے کی سب سے بہترین ڈش وہی ہو۔

نند دلارے نے کھانا کھاتے کھاتے محسوس کر لیا کہ دلیپ، نربدا کی آمد کو پسند نہیں کرتا ہے اور نہ ہی نربدا اسے پسند کرتی ہے۔ نند دلارے اسے محسوس کر کے خوش ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہو کر نند دلارے کا التفات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد نند دلارے نے کہا۔ "میں کام بانٹ دیتا ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد نربدا برتن مانجے گی اور رسوئی دھوئے گی۔ تم باؤلی سے چار گاگر پانی لاکر اسے دو گے۔"

دلیپ بولا۔ "میں تو لکڑی کاٹتے کاٹتے دن بھر میں تھک گیا۔ اب چار گاگر پانی۔!"

"اچھا دو گاگر پانی یہ لائے گی، دو گاگر تم۔؟"

نربدا اور دلیپ دونوں باؤلی سے پانی بھرنے لگے۔

نربدا باؤلی کے کنارے بیٹھ کر پہلے ہاتھ منہ دھونے لگی۔ آہستہ سے دلیپ بولا۔ "مجھے معلوم ہے تم یہاں کیوں آئی ہو۔ راوت کے یہاں تم مجھے اس لئے جل دے سکیں کہ مجھے تمہاری آمد کا علم نہ تھا۔ اب یہاں اس آسانی سے تم مجھے جل نہیں دے سکو گی۔"

نربدا سسک کر بولی۔ "میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔ مجھ پر کسی چڑیل کا سایہ ہے۔"

"چڑیل تم خود ہو اور دوسری سایہ نکالنے کی بات۔ میرے کمرے میں چلو۔ آدھے گھنٹے میں تمہارے اندر کی چڑیل کی ہڈی پسلی ایک نہ کر دوں تو جو کالے چور کی سزا وہ میری۔"

نربدا رونے لگی۔ "مجھے دھکی مت دو۔ میں مصیبت کی ماری ہوں۔"

یکایک پیچھے سے نند دلارے کی کڑک دار آواز سنائی دی۔

"تم اسے کیوں ستا رہے ہو۔ بیچاری، بے آسرا غریب لڑکی کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا کے میرا سہارا لینے آئی ہے۔ پھر تم نے اسے کچھ کہا تو کان پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔"

دلیپ چونک گیا۔ حیرت سے پیچھے دیکھنے لگا۔ نند دلارے جی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ نربدا ساڑی کے آنچل سے آنسو پونچھے جاتی تھی۔ اب جا کے دلیپ کو لڑکی کی بر وقت ہوشیاری کا اندازہ ہوا۔ دلیپ کو گمان تک نہ تھا کہ نند دلارے یوں ان کے پیچھے چلا آئے گا۔ مگر نربدا نے آنکھوں کے کونے سے اسے آتے دیکھ کر سسکنا شروع کر دیا تھا۔ اُفوہ، بے حد کائیاں لڑکی ہے اس سے نپٹنا آسان نہ ہوگا۔

اگلے چار دن میں دلیپ کو گھر کی تلاشی لینے کا کوئی موقع نہ ملا۔ اگر نند دلارے گھر سے باہر جاتا تو نربدا موجود رہتی اور نربدا جنگل کو جاتی تو نند دلارے موجود رہتا اور جب نربدا اور دلیپ دونوں گھر میں موجود رہتے تو ایک دوسرے پر ایسی کڑی نظر رکھتے کہ ان دونوں میں کسی کو تلاشی کا موقع نہ ملتا۔

مگر دھیرے دھیرے دلیپ پر ایک بات واضح ہو گئی۔ رسوئی سے ملحق کمرے میں ضرور کچھ ہے۔ دن میں ایک بار کبھی دو بار نند دلارے اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جاتا تھا۔ اکثر دروازہ اندر سے بند کر کے آہنی الماری کا پٹ کھولتا اور دیر تک منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آخر میں دونوں ہاتھ جوڑ کر الماری کے دونوں پٹ بند کر کے الماری کو مقفل کر دیتا۔

"موقعہ ملتے ہی مجھے دیکھنا پڑے گا۔ اس آہنی الماری میں کیا ہے۔؟"
دلیپ نے دل ہی دل میں سوچا اور اس لڑکی سے پہلے دیکھنا پڑے گا۔
اس سلسلہ میں اسے ایک ترکیب سوجھنے لگی۔

ایک دن جب نند دلارے الماری کے پٹ بند کر رہا تھا اور دلیپ موقع دیکھ کر وہاں سے گزر رہا تھا، اس نے کمرے کے باہر سے کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

"گورو جی اس الماری میں کیا ہے۔ جس کو آپ نے ابھی پرنام کیا ہے۔؟"
نند دلارے گھبرا کر چونکے۔ دیکھا تو کمرے کے دونوں دروازے کھلے رہ گئے تھے۔ بولے۔ "اس الماری میں مہا کالی کی مورت ہے۔ اور اس کے درشن سے مجھے معلوم ہو جاتا ہے دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔"

دلیپ بولا۔ "تو اپنے چیلے کو بھی اس مورتی کے درشن کرا دو۔"

"نہیں نہیں۔" نند دلارے بلند آواز میں بولے۔ "اس مہا کالی کی مورت کو میں نے سدھ کیا ہے۔ اس لئے میں ہی اس کے درشن کر سکتا ہوں۔ دوسرا جو کوئی بھی، جس نے اسے سدھ نہ کیا ہو اس کے درشن کرنے کی کوشش کریگا تو وہ درشن کرتے ہی مر جائے گا۔ اس مورتی کے درشن کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔"

"تو مجھے بھی اس مہا کالی کی سدھی کرا دو گورو جی۔"

"بیس برس لگے ہیں مجھے۔ تو اتنے برس یہاں ٹکے گا۔"

"اب آگیا ہوں تو جیون بھر آپ کے چرنوں میں جیون بتانے کا ہی ارادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ابھی تو پہلا ہی منتر سدھ نہیں ہوا ہے۔ بول گیا ہے منتر۔ ؟"

دلیپ بولنے لگا۔

"انڈو منڈو شنڈو
بانے بھائی کالے بھائی سالے بھائی
شانتی بھائی کانتی بھائی مانتی بھائی
ثور حمل درک
مین منتقن کرک
بول شانتی بول شانتی بول شانتی
مانتی مانتی مانتی۔"

دیپ نے منتر دوہرا کر بڑی مایوسی سے سر ہلایا بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا اس منتر کو بار بار دوہرانے سے کیا ہوگا۔؟"

"ابے گدھے۔" پنڈت نند دلارے اسے سمجھاتے ہوئے بولے: "تو آواز کی حقیقت اور اس کی شدّت سے نا واقف ہے۔ اتنا تجھے سمجھا چکا ہوں پھر بھی تیری سمجھ میں نہیں آتا۔ بول کیا تو نے سنا نہیں ہے کہ جب سُپر سانک ہوائی جہاز فضا میں اڑتے ہیں تو نیچے مکانوں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں —— کیوں۔؟ آواز کی طاقت سے۔! تو نے سُنا نہیں ہے کہ سائنس دانوں نے آواز کے ہیٹر بنا لئے ہیں جن پر کھانا پکایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی منتر کے متواتر جاپ سے آواز کا پریشر پیدا ہو سکتا ہے اس قدر کہ گھر کی چھت اڑ جائے تو دس لاکھ بار اس منتر کو جاپ کر کے دیکھ: پھر دوسرے منتر کا جاپ بیس لاکھ بار کرنا پڑیگا۔

پھر تیسرے منتر کا چالیس لاکھ بار جاپ جب تو کرے گا تو خود بخود بجلی کی طرح تیرے من میں وہ پرکاش پیدا ہوگا جس سے تو اپنے سامنے کھڑے کسی شخص کی بھی زندگی بتا سکے گا۔ لیکن اگر گورو پر بھروسہ نہیں ہے تو اٹھا بوریا بستر اور نکل جا فوراً یہاں سے۔"

گورو کے الفاظ میں دلیپ کو گہری سنجیدگی کے علاوہ وہ دھمکی نظر آئی، جیسے اب گورو نند لالا رے، دلیپ سے نجات پانا چاہتے ہوں۔ لڑکی جو آگئی ہے۔ دلیپ نے سوچا اس کے ساتھ اکیلے رہنا چاہتے ہیں۔ میرا وجود اب انہیں اکھرتا ہے ٹھیک ہے گورو۔ میں بھی اپنا کام جلدی سے ختم کر کے تجھ پر تین بار لعنت بھیج کر جاتا ہوں۔

یکایک دلیپ کا لہجہ بے حد عاجزی کا ہو گیا۔ سر جھکا کر بولا۔ "من میں شنکا پیدا ہوئی تو یہ بات پوچھ لی۔ اب آگے آنکھیں بند کر کے جو گورو جی کہیں گے وہی کر دوں گا۔"

نند لالا رے نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے پچاس روپے اور ایک تھیلا دے کر بولا۔ "شاباش بچے تجھ سے یہی امید تھی۔ اب یہ رقم لے کر نیچے بھرڑ گلی میں جا اور مہینے بھر کا راشن لے آ ہم تینوں کے لئے۔ وہیں لستو کلال کی دوکان بھی ہے۔ دو بوتلا دیسی لے آنا۔ پھر راشن پہنچا کے جنگل میں لکڑی کاٹنے جانا۔"

گویا دن بھر کا پروگرام ہے۔" دلیپ نے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ دن بھر مجھے گھر سے باہر کا باہر رکھیں گے تاکہ اکیلے میں اس حرامزادی سے چہل کر سکیں۔ مگر جانتے نہیں کس آفت کی پڑیا سے واسطہ پڑے گا۔"

"کیا سوچ رہے ہو۔ ؟" نند لالا رے نے پوچھا۔

"سوچتا ہوں۔ کیا گورو جی شراب بھی پیتے ہیں۔ دو بوتل دیسی کس کیلئے؟"
نند دلارے بھڑک کر بولے۔ "گورو شراب ہی نہیں پیتے، بھنگ بھی پیتے ہیں۔ افیون بھی کھاتے ہیں۔ جس نے مہا کالی کو سدھ کیا ہے۔ اس پر دنیا کے کسی نشے کا اثر نہیں ہو سکتا۔"

دلیپ نے بھرڑ گلی میں جا کر بھاماں کا پتہ لگایا۔ معلوم ہوا وہ کسی شادی میں دوسرے گاؤں گئی ہے۔ مایوس ہو کر اس نے راشن خریدا اور دو بوتل دیسی۔ واپس گھر آیا تو نرمدا کو بے حد مصروف پایا۔ وہ باؤلی سے گاگر پہ گاگر لا کر سارا دالان دھو رہی تھی۔ لگتا تھا وہ اپنے آپ کو اس قدر مصروف اور گندا رکھ رہی تھی تاکہ گورو جی کو اس سے منہ منت ہونے کا موقعہ نہ مل سکے۔

راشن دے کر دلیپ نے کلہاڑی اٹھالی اور لکڑیاں کاٹنے چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو پنڈت جی تیوریاں چڑھائے شوالے میں موجود تھے۔ دلیپ نے سمجھ لیا۔ کام نہیں بنا۔ لڑکی نے پٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیا کیونکہ گورو جی کی پوجا کے لہجہ میں بھگوان کے لئے بھی خفگی اور دھمکی کے عناصر موجود تھے۔ شام ہونے کے بعد نرمدا نے گورو جی کے آرڈر پر ان کے لئے بیسن کے پکوڑے تل دیئے اور وہ مہا کالی کی مورتی والے کمرے میں دروازہ بند کر کے اور بوتلیں لے کر بیٹھ گئے۔

دلیپ دن بھر کی دلیل سے تھک چکا تھا۔ وہ جلد کھانا کھا کے سو جانا چاہتا تھا۔ مگر جب تک گورو جی کھانا نہ کھالیں چیلا اور چیلی کیسے کھائیں۔

وقت ٹالنے کے لئے آج نرمدا دھیرے دھیرے کھانا پکاتی رہی۔ دلیپ رسوئی کے باہر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نربدا دھیرے سے بولی۔ "آج دن بھر اس نے مجھے ستانے کی بہت کوشش کی۔"

"تو میں کیا کروں۔؟" دلیپ نے غصیلی سرگوشی میں کہا۔

"وہ آج شراب پی کر پھر مجھ پر حملہ کرے گا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" دلیپ نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

"بڑی گندی بات ہے۔"

"کیا ـــ عورتوں کو چھیڑنا۔" دلیپ نے پوچھا۔

"نہیں، دانتوں سے ناخن کاٹنا۔" نربدا نے جواب دیا اور چولہے پر چڑھی پتیلی میں چمچہ چلایا پھر بولی۔ "تم میری مدد کرسکتے ہو۔؟"

"میں کیوں کروں۔؟ اس دن رات کے گھر پر تم نے میری کتنی مدد کی تھی۔"

"وہ بات اور تھی۔" نربدا بولی۔ "یہ بات اور ہے ـــ وہ تو اپنے اپنے لک کی بات ہے۔ سونے کا پترا مجھے ملے کہ تمہیں کسی کو بھی نہ ملے۔ وہ لک کی بات ہے۔ یہ اور بات ہے۔"

"یہ کیا بات ہے۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

"یہ ایک مجبور لڑکی کی عزت کا سوال ہے۔"

"اوہو۔" دلیپ اسے چڑاتے ہوئے بولا۔ "تم اور عزت۔"

غصہ سے نربدا نے گرم گرم سالن بھرا چمچہ دلیپ کی طرف پھینک دیا۔

دلیپ ہنس کر پرے ہو گیا اور سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

کوئی دس بجے کے قریب پنڈت جی مہاکالی کے کمرے سے برآمد ہوئے۔ لال لال آنکھیں لئے لڑکھڑاتے ہوئے گرج کر بولے۔ "کھانا لاؤ۔"

دلیپ اور نند دلارے کو نربدا نے کیلے کے پتوں پر کھانا پروس دیا۔ نند دلارے نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور جی بھر کے نربدا کو تاکا۔

نربدا بے حد معصوم بنی جھکی جھکی آنکھوں سے کھانا پروستی رہی جیسے اس نے کچھ دیکھا نہ ہو۔ کچھ سمجھا نہ ہو۔ کچھ محسوس نہ کیا ہو۔ وہ آج دوسرے سب دنوں سے مظلوم اور مصیبت کی ماری معلوم ہوتی تھی۔

گورو جی نشے میں ہنکار کر بولے۔ "مجھے ایسی مظلوم مصیبت کی ماری لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جی چاہتا ہے انہیں پکڑ کر کچا چبا جاؤں۔"

"کیا۔ ؟ کیا۔ ؟" دلیپ نے پوچھا۔

یکایک گورو جی کو ہوش آ گیا۔ بولے۔ "کچھ نہیں، کچھ نہیں۔"

پھر کھانا کھا کے بولے۔ "اب سو جاؤ۔ تینوں لالٹینیں بجھا دو۔ اکدم اندھیرا اکدم خاموشی۔ آج ہم رات بھر جاپ کریں گے۔"

لالٹینیں بجھا دی گئیں۔ سب سو گئے۔ نند دلارے جی اپنے کمرے میں اور دلیپ اپنے کمرے میں۔ نربدا اپنے کمرے میں۔ نربدا کو دلیپ کے ساتھ والا کمرہ ملا تھا۔ اس میں اندر کی طرف کوئی چٹخنی نہیں تھی۔ نربدا ایک کونے میں دبک کر پڑ گئی۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد پنڈت جی اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ دبے پاؤں نربدا کے کمرے کی طرف چلے۔ راستہ میں کسی سے ٹھوکر لگی تو گر پڑے۔ دو ہاتھوں نے سہارا دے کر اٹھایا تو معلوم ہوا دلیپ ہے۔

"تم یہاں دالان میں کیا کر رہے ہو۔ ؟" پنڈت جی بھڑک کر بولے۔

"سو رہا تھا۔" دلیپ نے مسکین بن کر جواب دیا۔

"مگر میں نے تمہیں اپنے کمرے میں سونے کے لئے کہا تھا۔"

"کمرے میں گرمی بہت تھی۔"

"چلے جاؤ اپنے کمرے میں اور سو جاؤ فوراً۔ دالان سونے کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں سانپ آتے ہیں۔"

دلیپ بستر لے کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے بالکل دروازے سے لگ کر اپنا بستر بچھا لیا۔ اب اس کے اور دالان کے بیچ میں صرف دروازے کی چوکھٹ ہی تھی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد پھر دلیپ کو آہٹ سی محسوس ہوئی۔ دلیپ زور سے کھانسا۔

پنڈت جی کی آواز آئی۔ "تم ابھی تک سوئے نہیں۔"

دلیپ بولا۔ "انڈو منڈو شنڈو۔"

"میں کیا پوچھتا ہوں۔!" نند دلارے گرج کر بولے۔

"جاپ کر رہا ہوں۔" دلیپ نے جواب دیا۔

"سوئے کیوں نہیں۔؟"

"نیند نہیں آئی اس لئے سوچا جاپ کر لوں۔ آج میں ہزار بار جاپ کرتا تھا صرف سولہ ہزار بار کیا ہے۔"

"چار ہزار بار صبح اٹھ کر کر لینا۔"

"نہیں کر سکتا۔" دلیپ بولا۔ "آواز کا پرشٹ کم ہو جائیگا۔"

گورو نے دانت میں کر اپنے گالیاں دیں۔

"ٹھیک ہے گورو جی۔" دلیپ بولا۔ آدھے گھنٹے میں جاپ ختم کر کے سو جاؤنگا۔"
ایک گھنٹے کے بعد پھر آہٹ محسوس ہوئی۔ دلیپ اٹھ کر بیٹھ گیا مگر کچھ بولا نہیں۔
پنڈت جی اس کے دروازے کے سامنے سے نکل گئے۔

نربدا نے آہٹ سن لی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بھیڑ کر بند کر لیا۔
اور خود دروازے پر پیٹھ لگا کے اسے روک کے کھڑی ہو گئی۔

پنڈت جی نے دو چار بار نربدا کے کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا۔
آہستہ سے آوازیں دیں۔ نربدا، نربدا...... مگر نربدا نے دروازہ نہیں کھولا۔

" نربدا، دروازہ کھول۔" نند دلارے جی نے اپنی سرگوشی میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

نربدا نے دروازہ نہیں کھولا۔

دلیپ نے اپنے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔

" بول شانتی بول شانتی بول شانتی
نہیں مانتی نہیں مانتی نہیں مانتی"

" ایں۔" گورو جی پلٹ کر بولے۔ " کیا کہتا ہے تو۔؟"

" ابھی جاپ ختم نہیں ہوا گورو جی۔"

" تیری ماں کو لے جائے لستو کلال۔" پنڈت جی برافروختہ ہو کر پلٹے اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ " نکما رہ رات بھر، صبح اٹھ کر اپنا بوریا بستر گول کر۔"

پنڈت جی کپتے جھکتے اپنے کمرے میں چلے گئے اور اندر سے زور سے دروازہ

بند کر دیا ۔

تھوڑی دیر میں ان کے خراٹوں کی آواز آنے لگی ۔

نند ولارے کی دھمکی میں گہرا غصّہ تھا۔ دلیپ نے سوچا اُسے جو کچھ کرنا ہے۔ آج ہی کر لینا ہے ۔

دلیپ نے ایک پتلی آہنی سلاخ کے ذریعے تند: لارے کے کمرے سے ملحق کمرے کو کھول لیا۔ دبے پاؤں الماری کے پاس گیا جس کے اندر مہا کالی کی مورتی رکھی تھی۔ آج اس نے ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ ایک پنسل ٹارچ اور یہ فولادی سلاخ جنگل میں گزرتے ہوئے اوزاروں سے اٹھا کے لے آیا تھا۔ اس ایک فولادی سلاخ کو توڑ موڑ کر وہ زبردست سے زبردست تالا کھول سکتا تھا۔ الماری کا تالا کھولنے میں اسے چند منٹ لگے۔

پھر اس نے ٹارچ کی روشنی الماری کے اندر ڈالی۔ بہت جلد اسے مہا کالی کی مورتی نظر آ گئی۔ اسے دیکھ کر اس کا دم نہیں نکلا جیسا کہ جیوتشی نے اسے ڈرایا تھا۔ یہ مورتی چاندی کی تھی۔ مہا کالی کی دیوی کنول کے پھول پہ بیٹھی تھی۔ اور اس کے سندر مکھڑے کے چاروں طرف سات سانپ تھے۔ اور سب ہی ساتوں سانپ کنڈلی مارے

کنول کے نیچے اپنی دموں کو لپیٹے بیٹھے تھے۔

دلیپ نے سوچا۔ سوتے کی کان والا ٹکڑا اسی مورتی کے اندر کہیں ہوگا۔ جب ہی تو نند دلارے جی روز اسے دیکھ کر اپنی تسلی کر لیتے ہیں۔

وہ دیر تک اس مورتی کو اُلٹ پلٹ کر اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ ساتوں سانپ کے ساتوں سروا، کو اس نے گھنڈی کی طرح ہلا کر دیکھا مگر کہیں پر اسے کوئی گھنڈی یا بٹن دکھائی نہ دیا۔ نہ کوئی سوراخ۔ نہ کیل۔ جس کے ذریعہ وہ اس مورتی کو اندر سے کھول کے دیکھ سکتا۔ اس نے مورتی کو دیوار سے بجا کر دیکھا۔ مورتی چاندی کے پترے کی نہیں بنی تھی۔ ٹھوس چاندی کی مورتی تھی۔ چاندی کے پتروں کی بنی ہوتی تو دیوار سے ٹکرانے سے مختلف قسم کی گونج پیدا ہوتی۔

دلیپ نے مایوس ہو کر مورتی کو واپس الماری میں رکھ دیا۔ پھر ٹارچ کی روشنی سے الماری کے مختلف کونوں، گوشوں کو دیکھنے لگا۔ مگر اسے یہ جان کر اور بھی مایوسی ہوئی کہ الماری میں اس مورتی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

بے حد مایوسی کے عالم میں وہ الماری کو بند کرنے والا تھا کہ اتنے میں اس کے عقب میں کمرے کا دروازہ کھل گیا اور نند دلارے جی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں پستول لئے داخل ہوئے۔

دلیپ کی طرف دیکھ کر طنزاً بولے۔ "کہو بٹیا، جو ڈھونڈنے آئے تھے مل گیا؟"

دلیپ بولا۔ "نہیں چاچا آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں تو چھا کالی کی مورتی دیکھنے آیا تھا۔ درشن کر کے پرسن ہو گیا۔ بے حد خوب صورت مورتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے بھلا کوئی آدمی مر سکتا ہے۔ عمر بڑھ جاتی ہوگی۔"

نندولارے نے پستول کا رُخ سیدھا اس کے سینے کی طرف کر کے کہا۔ "تمہاری عمر تو میں اسی وقت ختم کر سکتا ہوں مگر تمہاری جوانی دیکھ کر ترس آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم کس لئے میری موسی کے بیٹے کا بھیس بدل کر یہاں آئے ہو۔ تم سے پہلے بھی بہت سے لوگ ادھر آ کے گئے مگر جس چیز کی ان کو تلاش تھی۔ وہ نہیں ملی۔ نہ ان کو ملی نہ تمہیں ملے گی۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

دلیپ نے کہا۔ "اچھا چاچا۔ صبح چلا جاؤں گا۔"

نندولارے نے کہا۔ "صبح نہیں ابھی جاؤ گے۔ اور پھر کبھی میرے گھر میں قدم نہیں رکھو گے۔"

"میں اپنا جھولا تو لے لوں۔"

"لے لو۔"

دلیپ نے اپنا جھولا لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مگر نندولارے نے اسے کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ ہر وقت وہ نندولارے کے پستول کی زد میں رہا۔ آخر مجبور ہو کر اسے گھر سے باہر نکل جانا پڑا۔ پھر اس نے باہر کے دروازے کے اندر کنڈی لگانے کی آواز سنی۔ جب گھر سے پلٹ کے آگے بڑھا تو سامنے جنگل تھا۔ سائیں سائیں کرتا ہوا چیڑھ کا جنگل۔ ہوا کا کوئی زور کا جھونکا آتا تو چیڑھوں کے جھومر شمال سے جنوب اور پورب سے پچھم تک سرگوشیوں کے سنگیت میں نغمہ سرا ہو اٹھتے۔ پھر اکدم خاموشی ...... پھر کسی گیدڑ کی آواز اور کسی اونچی شاخ پر کسی سوتے ہوئے پرندے کے اچانک جاگ کر پھڑپھڑانے کی آواز۔ پھر دور کہیں باگھ بولا اور دلیپ نے سوچا اس وقت آدھی رات کے وقت جنگل میں سفر کرنا خطرے

سے خالی نہیں۔ وہ گھر کے باہر ہی پتھر کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اور بیٹھے بیٹھے اونگھتے اونگھتے اس چبوترے پر سو گیا۔

کسی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک سیار کو دم دبا کر اپنے قریب سے بھاگتے دیکھا۔ شکر ہے کوئی گیدڑ ہی تھا۔ باگھ یا ٹائیگر نہیں تھا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ افق جیسے نرمل پانی۔ نتھرا نتھرا سا۔ چاندی کی رنگت لئے ہوئے کوئی دم میں اجالا ہونے والا ہے۔ دلیپ نے سوچا پھر وہ جھولا سنبھال کر، چھلانگ مار کر چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ اور جنگل میں گھس گیا۔

اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ مگر اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ سب سے پہلے اسے بھرٹکل گاؤں میں جانا پڑیگا۔ مگر اس سے بھی پہلے اسے جنگلی کیلوں کے جھنڈ میں سے اپنا گڑا ہوا سامان نکالنا ہوگا۔

کیلوں کے جھنڈ کے اندر سے اُسے اپنا سامان نکالنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ سامان نکال کر اس نے اپنا جھولا پھر بھر لیا۔ پھر وہاں سے اُتر کر نیچے کے تلے کی باؤلی پر چلا گیا۔

باؤلی بہت پرانی تھی۔ اور چو طرفہ سیاہی مائل پتھروں کی سلوں کے چار زینے تھے۔ دو طرف گھنے پیڑوں کی قطاریں تھیں اور دو طرف نیلا دھاری کی گھنی جھاڑیوں کے اوپر جنگلی انگور کی بیلیں تھیں مگر ابھی جنگلی انگور کے خوشے اودے نہ ہوئے تھے۔

وہ اُتر کر باؤلی کے آخری زینے پر چلا گیا۔ اور دیر تک اپنے ہاتھ پاؤں

دھوتا رہا۔ پھر اس نے دیر تک اپنی آنکھوں پر چھینٹے دیئے۔ چار پانچ بھرے بھرے گھونٹ سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ کیونکہ اُسے ناشتہ تو اب پھر کل گاؤں میں جا کر ہی ملے گا۔

ہاتھ منہ دھو کر جب وہ پلٹا تو اسے باؤلی کے پچھلے زینے پر سہاماں بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ دلیپ کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں جھک گئیں اور لانبی لانبی پلکیں جھالروں کی طرح سرخ ریشم کے رخساروں پر لرزنے لگیں۔ وہ تھوڑی سی ہانپ رہی تھی۔

"کہیں دور سے آ رہی ہو۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "ہاں، ایک سہیلی کی شادی میں گئی تھی۔"

دلیپ نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا۔"

"کیسے۔؟"

"میں تمہارے گاؤں گیا تھا۔ تمہیں ڈھونڈا تو معلوم ہوا۔"

"مجھے کیوں ڈھونڈا۔؟"

دلیپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سہاماں پھر بولی۔ "اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہو۔؟"

"چاچا نے نکال دیا ہے۔" دلیپ بولا۔

"تو پھر واپس جا رہے ہو۔؟"

"نہیں تو کیا کروں۔؟"

سہاماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے بغل میں دبائی ہوئی پوٹلی اور

سوہنی کے سر سے باندھی ہوئی جوتی الگ الگ باؤلی کی سب سے اونچی اوپر کی سل پر رکھ دی۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی باؤلی کے سب سے نچلے زینے پر جا کر منہ دھونے لگی۔ منہ دھو کر جب اس نے دوپٹے سے چہرہ پونچھا تو دلیپ کو ایسا لگا جیسے گلاب کا پھول کھل گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر جب وہ باؤلی کے زینے سے اٹھی تو اس نے دیکھا دلیپ اس کے پیچھے ذرا اوپر والے زینے پر کھڑا ہے۔ بھاماں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر نرم اور کومل آواز میں پوچھا۔

"تم نے بتایا نہیں تم مجھے کیوں ڈھونڈھ رہے تھے۔؟"

دلیپ نے اسے دونوں بانہوں میں اٹھا لیا اور باؤلی کے اوپر کے زینے پر لے آیا جہاں بھاماں کی پوٹلی پڑی تھی۔ وہاں اس نے بھاماں کو کھڑا کر دیا۔ اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کو چوم کر بولا۔

"بتاؤں کیا۔؟"

"ہائے رام۔" کہہ کر بھاماں پتھر کی سل پر بیٹھ گئی۔ اور دھیرے دھیرے پوٹلی کھولنے لگی۔ "بڑے بے شرم ہو جی۔" وہ پوٹلی کھولتے کھولتے بولی۔

دلیپ نے ذرا دلیر ہو کر کہا۔ "ابھی تم نے میری بے شرمی دیکھی کہاں ہے۔؟"

"چپ۔!" وہ مٹک کر بولی۔ "شور مچا دوں گی۔"

"شور مچا دو گی تو یہاں اس وقت سننے کون آئیگا۔؟"

اب تک بھاماں نے پوٹلی کھول لی تھی۔ گیہوں کی تین موٹی موٹی روٹیوں کے اندر کھیرے اور ہری مرچوں کا اچار تھا۔ اور پیاز کی دو گٹھیاں۔ ......

دلیپ کی بھوک تیز ہونے لگی۔

"کھاؤ گے۔؟" سجاماں نے پوچھا۔

دلیپ نے آہستہ سے سر ہلایا۔

سجاماں اور وہ دونوں ایک ہی پوٹلی کے اندر سے لقمے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ لقمے توڑتے توڑتے انگلیوں کی پوریں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں۔ کبھی ایک ہی لقمے کے دو ٹکڑے ہو جاتے کبھی ایک ہی مرچ پر دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ سجاماں کی آنکھیں گہری پراسرار ہو گئی تھیں۔ اور درختوں کی چوٹیوں کے اوپر صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر میں ناشتہ ختم ہو جائیگا۔ تھوڑی دیر میں جنگلی انگور کے خوشوں کا رس بھی جلد کے اندر چمکنے لگے گا۔ تھوڑی دیر میں نیلا دھاری کی جھاڑیوں میں سوئی ہوئی بیڑیاں کلکلانے لگیں گی۔ چاروں طرف بھور پھیل جائے گی اور سجاماں اپنے گھر چلی جائے گی۔

پھر پوٹلی میں کچھ نہ رہا۔ گیہوں کی روٹیوں کے آخری ریزے بھی انہوں نے چن چن کر کھائے۔ جیسے وہ زندگی کی آخری آرزوئیں ہوں۔ پھر پوٹلی میں کچھ بھی نہ رہا۔

پھر وہ دونوں اٹھے اور اب دلیپ نے شکم سیر ہو کر باؤلی کا پانی پیا۔ دونوں ساتھ ساتھ لگے لگے بیٹھے بیٹھے اوک میں پانی اٹھا کر پیتے رہے اور پانی بڑے پیار سے ان کے ساتھ ہنستا رہا۔ پانی کبھی انسان کے غم کی طرح گہرا ہوتا ہے۔ کبھی اس کی خوشیوں کی طرح چنچل ہوتا ہے۔

پانی پی کر وہ دونوں اٹھے۔ سجاماں نے اپنے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کیا۔

پھر اپنے ہی دوپٹے سے دلیپ کا منہ پونچھ دیا۔ دلیپ نے اسے اپنی باہنوں میں بھر لیا اور اٹھا کر باؤلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بھاماں نے کمزور آواز میں پوچھا۔ "کہاں لے جا رہے ہو مجھے۔؟"

دلیپ نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر اونچے اونچے پیڑوں سے اتر کر جنگلی انگور کی بیلوں پر گئی۔ ان سے اتر کر نیلا دھاری کی گھنی جھاڑیوں پر پڑی جن کی اوٹ میں ہری ہری گھاس کا ایک خوشنما غالیچہ سا تھا۔

جب وہ بھاماں کو اٹھائے اُدھر جانے لگا تو بھاماں نے اس کے ایک کان کی لَو کو ذرا سا اپنے دانتوں سے کٹکٹا کر شہد بھری سرگوشی میں کہا۔

"یہیں میرے گاؤں میں رہ جاؤ نا۔"

جب کوئی عورت مکمل طور پر اپنے آپ کو مرد کے سپرد کر دیتی ہے تو اس کے بدن کی خوشبو کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔ دلیپ نے سوچا۔ بھابھی والی کے جذبات میں تندی تھی۔ اس لئے کریٹ کی کڑوی خوشبو تھی۔ آنا کے بدن کی اصلی خوشبو وہ جان ہی نہیں سکا کیونکہ وہ نقلی خوشبوؤں سے نہائی ہوئی تھی۔ اور جذبات میں سپردگی کا عالم نہیں تھا۔ کچھ حاصل کرنے کا عالم تھا۔ جیسے وہ خود کوئی کھانے والی چیز ہو۔ جیسے آنا نے چاٹ چاٹ کے کھا لیا تھا۔ کسی مزیدار ڈش کی طرح مگر اس پہاڑی لڑکی کی سپردگی کا عالم کچھ اور تھا۔ جیسے اسے کچھ حاصل کرنے میں نہیں کچھ عطا کر دینے میں مسرت اور والہانہ شادمانی محسوس ہو رہی ہو۔ کتنی ہی خوشبوئیں تھیں۔ اس کے بدن کی خوشبو جیسے چیڑھ کے جھومروں کی بھینی بھری خوشبو۔ کچے انگوروں کی چٹخی خوشبو اور ہری ہری دوب کی غنودگی آمیز خوشبو یکایک دلیپ نے اپنے آپ کو بجید فطرت کے ہم آہنگ محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے وہ اسی

آسمان اسی زمین اسی جنگل اسی وادی کا ایک حصہ ہے۔ اور اس سے الگ رہ کر اس نے اب تک جو زندگی گزاری تھی وہ کسی مصنوعی تہذیب کا حصہ تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بھاماں سے شادی کر کے خوش رہ سکتا ہے۔ صرف شادی نا کر کے ہی کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔ خوشی کے لئے ایک ماحول بھی چاہئے۔ ایسا ماحول جو فطرت کے بہت قریب ہو۔ اس نے تو ساری زندگی اس ماحول سے دور گزاری تھی مگر اب اس کی نظروں میں تہذیب، امارت، غریبی کے معنی بدلنے لگے۔ جو مزا اسے روکھی روٹی اور پیاز کی گٹھی میں ملا وہ اسے اپنے چاچا کے یہاں زعفرانی بریانی میں نہیں ملا۔ پھر ایسا آسمان اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ ایسے جنگل کا بلاوا کبھی نہیں سنا۔ ایسی لڑکی کی بھرپور سادگی اور سپردگی اس نے کبھی نہیں دیکھی۔ شاید یہاں کی تہذیب کی قدریں الگ ہیں اور ان کی قیمتیں مختلف ہیں۔

رد ٹھہری ندی میں پانی یکایک بڑھ گیا تھا۔ شاید دور اوپر پتھریلے پہاڑوں پر کہیں زور کی بارش ہوئی ہوگی۔ اس نے بھاماں کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور ندی پار کرنے لگا۔ بھاماں کے ہاتھ دلیپ کے رخساروں سے کھیلتے رہے۔ ان ہاتھوں کے لمس میں کتنا بھروسہ اور کتنی آسودگی تھی۔ جیسے اس الھڑ معصوم لڑکی نے سوچ لیا تھا کہ جیسے اس نے اپنے آپ کو دلیپ کے سپرد کر دیا تھا۔ اسی طرح دلیپ بھی ہمیشہ کے لئے اس کا ہو چکا ہے۔

ندی پار کر کے وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ دلیپ نے پوچھا۔

"تم نے پہلے بھی کبھی پریم کیا ہے۔؟"

"دو دفعہ۔" بھاماں بولی۔

"پھر کیا ہوا۔ ؟"

"وہ کہتے تھے ہم بھی تم سے پریم کرتے ہیں۔ کرتے رہیں گے۔ شادی کریں گے۔ گھر بسائیں گے۔ مگر ......" وہ یکایک چپ ہو گئی۔

"مگر کیا۔ ؟"

"وہ دونوں چلے گئے۔"

"ایک پریم اور دوسرے پریم کے درمیان کتنا عرصہ گزرا۔ ؟"

"تین بھری برساتیں گزر گئیں۔ ایک سوکھا...... اس کے بعد تم آئے تو چاروں طرف ہریالی ہے۔ ہریالی ہی ہریالی ہے۔"

"تم نے سوچا نہیں کبھی وہ تمہیں دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "ندی پانی پلاتی ہے تو کبھی سوچتی نہیں کہ کوئی اس میں تھوکے گا بھی۔"

دلیپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولا "میں نے تو تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔"

"نہیں۔ پر......"

"پر کیا۔ ؟"

"پہلے دن جب میں نے تم کو دیکھا۔ تم مجھے بہت اکیلے سے لگے۔ ننھے اور اداس سے۔ جی چاہا تم کو باہوں میں بھر لوں۔ تمہارے منہ سے وہ اداس مسکان اپنے دوپٹے کے پلو سے چھڑا لوں۔ تم کو اپنے گھر لیجاؤں۔"

دلیپ دھیرے دھیرے اس کی باتیں سن سن کر ہنستا رہا۔ پھر اکدم سنجیدہ ہو کے بولا۔ "شاید میں پھر کبھی نہ آؤں اور دوبارہ کبھی آجاؤں تو تم ہی سے شادی کرونگا۔ یہ میرا وچن ہے مگر میرا بھروسہ نہ کرنا۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔"

"مجھے اپنے ساتھ لیتے چلو۔" وہ بڑے حسرت بھرے لہجہ میں کہنے لگی۔ جیسے اُسے معلوم ہو اس کا جواب کیا ہوگا۔

وہ بولا۔" نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میری اپنی جان خطرے میں ہے۔ پھر تم کو خطرے میں کیسے ڈالوں۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ آیا تو ضرور تم سے شادی کروں گا۔"

"کب تک لوٹو گے۔؟"

"کہہ نہیں سکتا۔ چھ ماہ لگ جائیں گے۔ ایک سال لگ جائے۔ ہاں بس ایک سال کے لئے اگر ہو سکے تو میرا انتظار کر لینا بعد میں نہیں۔"

"میرا بس چلے تو زندگی بھر انتظار کر لوں۔ پر ایک سال تو کہہ ہی لوں گی۔ پھر کیا معلوم کیا ہو۔؟ میرے گھر والے میری شادی کر دیں۔ سونے پن سے دل گھبرا جاتے ہیں۔ اکیلے آنگن میں کانٹوں بھری جھاڑی بھی اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں شاید کوئی پردیسی پسند آجائے۔" دلیپ نے شریر لہجہ میں کہا۔

"کوئی کانٹوں بھرا جھاڑ۔"

وہ چنچل نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔" ہو سکتا ہے ...... پر تمہارے ایسا کوئی نہ ہوگا۔ اس سنسار میں۔ اس لئے جلد آجانا۔"

اب گاؤں کی چوحدی قریب آگئی۔ بھاماں نے سونٹی کی کھونٹی سے جوتیاں اتار کر پہن لیں۔ زور سے دلیپ کا ہاتھ پکڑ کر گہرے مضطرب لہجہ میں بولی۔

"کہیں مت جاؤ۔ میں ...... میرے پاس رہ جاؤ۔ میں اپنے گھر والوں کو منا لوں گی۔"

دھیرے سے دلیپ نے اس کا ہاتھ چھڑا لیا۔ آہستہ سے بولا۔ "نہیں بھاماں، مجھے جانے دو۔ جس کام کو پورا کرنے کا میں نے وعدہ کر لیا ہے اسے پورا کرنا ہی ہوگا۔"

بھاماں دھم سے گاؤں کی چودھری کے باہر کیلے کے ایک جھنڈ کے نیچے بیٹھ کر سسکنے لگی۔ اس نے دوپٹے سے اپنا منہ چھپا لیا اور اس کی ہچکیاں تیز ہوتی گئیں۔

دلیپ کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ بھاماں کے گاؤں کے اندر سے گزرے۔ وہ موڑ کاٹ کر گاؤں کے باہر ہی سے چلا گیا۔ چلتے چلتے اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا۔ بھاماں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ دلیپ نے ذرا سا ہاتھ ہلایا۔ بھاماں نے پھر دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ دیر تک کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی دلیپ کو یہ احساس ہوتا رہا کہ بہت دور تک بھاماں کی سسکیاں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اسے افسوس ہوا اس نے بھاماں کو چھوا ہی کیوں۔؟ پھر وہ لمحے یاد کر کے اس کا دل ایک عجیب سی شادابی سے بھر گیا۔ جو پیار بھاماں نے اسے دیا تھا۔ اس کی سادگی، معصومیت اور شہد بھری آسودگی سے اس کی روح کا کونہ کونہ بھر گیا تھا۔ کچھ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے عورتیں تو بہت آئیں گی اس کی زندگی میں کیونکہ اب وہ ایک دولتمند چاچا کا وارث تھا مگر ایسی معصومیت اسے جیون بھر نہ مل سکے گی۔ اسی لئے تو اس نے بھاماں کو ایک سال کے لئے انتظار کرنے کو کہا تھا۔ شاید یہ کام اس سے پہلے ہی پورا ہو جائے

وہ گاؤں کی چودھری گھوم کر واپس چڑھائی چڑھنے لگا۔ نند لال رے جی کے گھر کے آس پاس جنگلوں کی طرف اس کے قدم واپس جانے لگے۔ ایک دفعہ تو وہ ناکام ہوا تھا۔ دوسری دفعہ کی ناکامی اور وہ بھی ایک لڑکی کے ہاتھوں وہ برداشت بھی

نہیں کر سکتا تھا۔ اسے جیوتشی جی سے وہ سونے کا پترا حاصل کرنا تھا۔

وہ چلتے چلتے دیر تک سوچتا رہا۔ کیا ترکیب اختیار کرے۔ پھر چلتے چلتے وہ راستہ بھول گیا۔ اور ایک اکیلے پہاڑی گھر کے قریب آ نکلا۔ دو سیڑھی نما کھیتوں میں مکی کی فصل جھول رہی تھی۔ اور گھر کے پاس ایک بڑھیا اخروٹ کے پیڑ کے نیچے مرچیں سکھا رہی تھی۔

دلیپ بولا۔ "رام رام موسی۔"

بڑھیا نے سر اٹھا کر کہا۔ "رام رام۔ کہاں سے آ رہے ہو۔؟"

"سہجر کل گاؤں سے۔"

"کہاں جا رہے ہو۔؟"

"نندو لال رسے جی کے گھر کی طرف۔ مگر لگتا ہے راستہ بھول گیا ہوں۔"

"ہاں بہت بھول گئے ہو۔ وہ تو دکھن کی طرف ان کا گھر ہے اور تم ٹھیک اُتر کی طرف چلے آئے ہو۔ اور اب یہاں سے چلے بھی تو آدھی رات سے پہلے وہاں نہ پہنچ سکو گے۔"

"موسی اگر تم مانو تو رات میں یہیں رہ جاؤں۔ صبح چلا جاؤں گا۔ تم کھانا پکا دینا۔ میں دو روپئے دیدوں گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" بڑھیا نے پہلی دفعہ اسے بیٹا کہا۔ "رہ جاؤ۔ مگر بستر کا ایک روپیہ الگ سے لوں گی۔"

"اچھا، وہ بھی دیدوں گا۔ تم کیا یہی کام کرتی ہو ماں۔؟"

بڑھیا بولی۔ "تم نے غور نہیں کیا۔ میرے گھر کے سامنے سے یہ دیکھو خچروں

کا راستہ ڈھکی قصبے کو جاتا ہے۔ مہینے میں سات، آٹھ، دس بار خچر والے دوسرے قصبے کو سامان لے جاتے ہوئے یا وہاں سے لاتے ہوئے رات کو اکثر میرے یہاں پڑ جاتے ہیں۔ نو اتنی مہمانداری تو نہیں ہو سکتی بیٹا۔ پھر میرا بیٹا اور ایک ہی میرا بیٹا تھا وہ پچھلی لام میں مارا گیا۔ ساڑھے سترہ روپے مجھے اس کی پنشن ملتی ہے۔ سامنے دو کھیت ہیں۔ میری لڑکی جس گھر بیاہی ہے وہ لوگ آ کر ان میں ہل جوت کے فصل بنا دیتے ہیں۔ میری جندگی جیسے تیسے کر کے گزر جاتی ہے۔ گھر کا تازہ تازہ مکھن رکھا ہے۔ تم کہو گے تو آٹھ آنے میں وہ بھی دے دوں گی۔ ساگ، روٹی کے ساتھ مکھن کھانے کا مزا ہی اور ہے بیٹا ...."

بڑھیا بڑی لالچی معلوم ہوتی ہے۔ دلیپ نے سوچا مگر دلیپ نے جو ترکیب سوچی تھی اس کے لئے اسی جنگل میں قیام کرنا ضروری تھا۔ آج کی رات اس جنگل میں اس سے بہتر گھر کہاں مل سکتا ہے۔

اس نے جھولا اُتار کر اخروٹ کے نیچے پڑی کھاٹ پر رکھ دیا۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے موسی کو دیا۔ بولا: "موسی دو روپے کھانے کے ایک روپیہ بستر کیلئے آٹھ آنے مکھن کے لئے اور ڈیڑھ روپیہ صبح کے ناشتہ کے لئے۔ ٹھیک ہے۔؟"

بڑھیا اکدم خوش ہو گئی۔ اسے دعائیں دینے لگی۔

دلیپ نے کہا۔ "مگر مجھے دن ڈھلتے ہی کھانا دے دینا۔ میں کھانا کھا کے جلدی سو جاؤں گا۔ ناشتہ بھی صبح کے بجائے شام کے کھانے کے ساتھ تیار کر دینا۔ اسے میں لے کر رات کے تیسرے پہر اکیلا یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر دلیپ اچھل کر اخروٹ کے پیڑ کی ایک مضبوط شاخ سے جھولنے لگا۔

اس شاخ میں بڑی بڑی خوبانیوں سے کہیں بڑے بڑے آخروٹ لگے ہوئے تھے دلیپ نے ایک دو آخروٹ توڑ لئے اور انہیں نیچے آکر پتھروں سے توڑ کران کے اندر کا مغز کھانے لگا۔

بڑھیا مسکرا کر بولی: "بیٹیا۔ اگر تم چاہو، چھ آخروٹ اور توڑ لو تو آخروٹ کی چٹنی تمہارے لئے تیار کر دوں گی۔ صرف چار آنے میں......"

دلیپ زور، زور سے ہنسا۔ بوڑھی مائی کا لالچ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس نے جیب سے چار آنے نکال کے بڑھیا کو دیئے اور آٹھ، دس آخروٹ توڑ کر بڑھیا کے حوالے کئے۔

جب سورج مغرب کے پہاڑی سلسلہ پر ڈھلنے لگا تو ہوا میں یکایک خنکی بڑھ گئی۔ اس چھوٹی سی وادی میں ردائے شب اکدم ڈھل کر آگئی۔ جھاڑیوں میں جھینگروں کا شور اکدم بڑھ گیا اور کہیں کہیں تاریک شاخوں پر جگنو چمکنے لگے۔

بڑھیا نے دیئے جلائے۔ دلیپ کے لئے کھاٹ بچھا دی۔ اس پر کمبل ڈال دیا۔ پھر کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی۔

گرم گرم ساگ میں سفید سفید مکھن بھاماں کی انگلیوں کی طرح نرم اور ملائم خستہ کرکری مکئی کی روٹیاں اور آخروٹ کی چٹنی مزہ دے گئی۔ معلوم نہیں چولہے کے پاس بیٹھا بیٹھا وہ کتنی روٹیاں کھا گیا۔ پھر گلاس بھر کر اس نے پانی پیا اور کھاٹ پر دراز ہو گیا۔ تکیہ تو تھا نہیں اور چاچا کے گھر میں آنے سے پہلے وہ زندگی بھر تکیہ کے بغیر ہی سوتا رہا تھا۔ اس لئے تکیے کی کمی کو نیا پن محسوس نہیں کیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے داب لئے اور تکیہ بنالیا۔ آنکھیں تاریک چھت پر تھیں۔

آج دن بھر وہ بھاماں کے ساتھ جنگل میں رہا تھا۔ مگر نچلی ڈھلانوں پر۔ اگر دن میں کسی وقت نند دلارے یا وہ منحوس لڑکی اسے کھوجنے کے لئے آئے ہوں گے تو بے مراد واپس گئے ہوں گے۔ پھر بھاماں کو وہ نیچے گاؤں میں چھوڑ کر چکر کاٹتا ہوا اس بڑھیا کے گھر میں آ گھسا تھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ اُسے اس جنگل میں رات کاٹنے کے لئے یہ گھر مل گیا۔ ورنہ اس کے لئے بڑی مشکل ہوتی۔ اور جو ترکیب اس نے نند دلارے جی کے لئے سوچی تھی اسے عمل میں لانے کے لئے اسے رات بھر ان کے گھر کے آس پاس کہیں جاگتے رہنا ہوتا۔ اسے نند دلارے جی کے کڑوے الفاظ یاد آئے بھاماں کا لذت آمیز لمس نربدا کا جیوتشی جی کے لئے کھانا پکاتے ہوئے اس سے مدد کی درخواست کرنا۔ دھیرے دھیرے سارے چہرے گڈمڈ ہونے لگے اور وہ یکایک کروٹ بدل کر گہری نیند سو گیا۔

سونے سے پہلے اسے بڑھیا کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ دکھائی دیا جو دیئے کی روشنی میں تکلی پہ اُون بن رہی تھی۔

جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا کاٹ کر اسے سر پر اٹھائے ہوئے جب نربدا جیوتشی جی کی حویلی کے اندر پہنچی تو لکڑی کے گٹھے کی زمین پر دھم سے گرنے کی آواز پر جیوتشی جی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔

تھکن محنت اور بوجھ سے نربدا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ جیوتشی چند لمحے تو مبہوت ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جبکہ نربدا دھیرے دھیرے اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کر رہی تھی۔

"بہت لکڑیاں لے آئیں۔" جیوتشی جی نے گٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مل گئیں تو لے آئی۔ تین دن کے لئے کافی ہوں گی۔"

"جنگل میں کوئی ملا تو نہیں۔؟" نندلارے نے پوچھا۔

"کسان لوگ ملے تھے۔"

"اور کون۔؟"

"اور میری طرح عورتیں تھیں جو لکڑیاں چننے کے لیے آئی تھیں۔"

"کیا باتیں ہوئیں۔؟"

"کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں کترا کر نکل جاتی تھی۔"

نند دلارے جی نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت اچھا کیا تم نے بھر کل گاؤں کی عورتیں بہت چلتر باز ہوتی ہیں۔"

نربدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جیوتشی جی نے پھر پوچھا۔ "میری موسی کا لڑکا تو تمھیں نہیں ملا۔؟"

"وہ۔؟" نربدا نے 'وہ' پر زور دے کر پوچھا۔

"ہاں وہ۔"

"کہیں نہیں ملا۔ میں نے بہت چھان لیا جنگل کو کہیں نہیں ملا میرا خیال ہے وہ چلا گیا۔"

نربدا نے دیکھا۔ جیوتشی جی کو جتنی خوشی اس بات سے ہوئی وہ تین دن کی لکڑیوں کا گٹھا پا کر بھی نہ ہوئی تھی۔

"اب تم جلدی سے کھانا پکانے میں لگ جاؤ۔"

"پہلے اشنان کر لوں۔ کپڑے بدل لوں۔ شوالے میں جا کر پوجا کر لوں پھر چوکے میں بیٹھتی ہوں۔"

"اچھا۔!" کہہ کر نند دلارے چلا گیا۔

نربدا نے بال دھوئے۔ بال کسی حد تک سکھا بھی لئے۔ پھر ایک صاف ستھری لیکن سادہ ساڑھی پہن کر وہ بال اپنی کمر تک پھیلا لئے۔ پھر پھول لے کر شوالے میں گھنٹی بجانے لگی۔ جیوتش جی بھی پوجا کے بہانے سے اور دراصل اسے دیکھنے کے لئے شوالے میں اسی وقت آ گئے۔ وہ دونوں بار بار اور کبھی ایک ساتھ گھنٹی بجاتے تھے۔ اور کبھی ایک ساتھ دونوں کا ہاتھ ایک ہی گھنٹی پر پڑ جاتا تھا۔ اور جیوتش جی نے دیکھا کہ کسی بار بھی نربدا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے گھبرا کر ہٹایا نہیں۔

پوجا کے بعد وہ بولے۔ "میں تم کو سارا جیوتش سکھا دوں گا۔ جو تھا جو ہے جو ہوگا۔ تمہارے مستک کے آئینے میں تصویر کی طرح نظر آنے لگے گا۔ مگر اس کے لئے تمہیں میری چیلی بننا پڑیگا۔"

"وہ تو بنوں گی ہی۔" نربدا بولی۔ "مگر آپ کی رکھشا بھی چاہیئے مجھے۔"

"وہ تو ملے گی ہی۔ جب تم میری چیلی بن جاؤ گی تو پھر جیون سے مرتیو تک تمہیں میری رکشا ملتی رہے گی۔"

نربدا نے گورو جی کے پاؤں چھوئے۔ گورو جی نے نربدا کا پھول ایسا چہرہ اور پتلی کمر کا خم دیکھ کر سوچا اسے اسی وقت گلے سے لگا لیں مگر موقع مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنے آپ پر ضبط کر گئے۔ اور دھیرے دھیرے قدموں سے شوالے سے لے کر سونے گھر تک ہری ہری دوب میں بچھے ہوئے پتھروں پہ نربدا اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ اسے معلوم تھا گورو جی اسے تک رہے ہیں۔

گورو جی نے دیکھا آج گھر میں بہت روشنی ہے۔ کہیں پہ لالٹین ہے تو کہیں پہ دیئے کی روشنی۔ چولہے میں شعلوں کی روشنی اور شعلوں کے بالمقابل کسی شعلہ

حسینہ کے رُخ کی روشنی آج نند دلارے جی کے دل میں بھی اکدم بہت سے دیئے جل اٹھے تھے۔ بہت دنوں کے بعد ان کے گھر میں بہار آئی تھی۔ منہ مارنے کے لئے کبھی کبھی انہیں اِدھر اُدھر جنگل میں چرواہیاں یا لکڑی کاٹنے والی دیہاتی عورتیں تو مل جاتی تھیں۔ مگر وہ تو تیل میں تلی ہوئی جلیبی کی مانند تھیں اور یہ تو کھوئے کی نرم سفید برفی ہے۔ گورو جی کا جی للچانے لگا۔ آج انہوں نے رسوئی کے باہر ہی دالان کا ایک حصہ دھو کر لکڑی کا ایک پیڑھا بچھا لیا تھا اور کھڑاؤں اتار کر پیڑھے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تھے۔

"یہ کیوں۔ ؟" نربدا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"سوچا آج رسوئی کے باہر ہی تمہارے سامنے بھوجن کریں گے۔ تمہارے ہاتھ کے گرم گرم پھلکے، گھی میں چپڑے ہوئے سیدھے تمہارے ہاتھوں سے ہماری تھالی تک آجائیں گے۔ اس لئے اس قدر قریب بیٹھے ہیں۔"

گورو جی کی بات تو نربدا سمجھ چکی تھی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ آہستہ آہستہ سامنے کی تھالی میں بھوجن پروستی رہی اور گورو جی بیچ بیچ میں چٹخارے لگا کر کھاتے رہے۔ اس کے کھانے کی تعریف کرتے رہے، اور نربدا کے گھنے سیاہ بالوں میں چمیلی کے پھولوں کے گجرے کو دیکھ کر نہال ہوتے رہے۔ کھانا ختم کرتے ہوئے بولے۔

"گورو اور چیلی کے بیچ میں کوئی دیوار نہیں رہنی چاہیئے کوئی بھی آتمک یا شاریرک دیوار نہ ہونی چاہیئے۔ ودیا گرہن کرنے کے لئے دلوں کا ملن۔ گورو اور شیش کے دلوں کا ملن ضروری ہے۔"

نربدا نے ایک بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، پھر اکدم نظریں جھکا لیں۔ گورو جی کو معلوم ہوا جیسے دور اوپر پہاڑوں پہ بدلی میں بجلی چمک گئی

بس ایک پل کے لئے . . . . گورو جی کا دل کہیں اس نگاہ کے تیر میں اٹک کر ڈوبنے لگا .
دھیرے سے بولے .

" سمجھتی ہو - ؟ "

" جی . " بڑی کمزور آواز میں نربدا کے منہ سے نکلا .

گورو جی بولے . " سونے سے پہلے مجھے دودھ کا ایک گلاس پینے کی عادت ہے "

" میں لے آؤں گی ۔ "

" اور آدھے گھنٹے کے لئے پاؤں دبوانے کی بھی عادت ہے . "

نربدا نے سوچا پوچھوں . جب میں نہیں تھی تو کون دباتا تھا . مگر پھر سوچا پوچھنے سے معاملہ بگڑ جائے گا . وہ مجھے جو سمجھ رہے ہیں وہی سمجھتے رہیں تو اچھا ہے . اس لئے بڑی میٹھی آواز میں " جی " کہکر چپ ہو رہی .

گورو جی نے تھالی پرے سرکا دی . اٹھ کر ننگے پاؤں لکڑی کی کھڑاؤں تک گئے . انہیں پہن کر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چلے گئے .

کمرے کی دہلیز پہ کھڑے ہو کر بولے . " ذرا جلدی آ جانا . "

نربدا رسوئی کے دروازے سے لگی شرم و حیا کی تصویر بنی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدر رہی تھی . آہستہ سے بولی .

" جی اچھا . "

نربدا نے رسوئی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا ، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا . کھا کر اپنی ساڑھی جو رسوئی میں بیٹھے بیٹھے گیلی ہو گئی تھی ، اسے اتار کر دوسری صاف ستھری ساڑھی پہن لی . آنکھوں میں کاجل لگایا . پھر اپنی پوٹلی کھول کر اس میں سے کاغذ کی

ایک پڑیا نکالی اور اسے اپنی ساڑھی میں اڑس کر رسوئی تک گئی۔ گرم گرم دودھ کو ایک بڑے گلاس میں انڈیل کر اس میں مناسب شکر ڈال کر اسے چمچے سے چلایا۔ پھر پڑیا کھول کر اس میں کا سفید پاؤڈر دودھ میں گرا کر اسے پھر اچھی طرح چمچے سے چلا دیا۔ اور پھر گلاس ہاتھ میں تھا کر دھیرے دھیرے قدموں سے گورو جی کے کمرے کے اندر آ گئی۔

گورو جی لیٹے ہوئے کب سے انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بستر سے اٹھ بیٹھے۔ زبیدا کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر غٹا غٹ پی گئے۔ زبیدا اُن کے چرنوں میں بیٹھ کر ان کے پاؤں دابنے لگی۔ کیسے ریشم کی طرح ملائم ہاتھ ہیں۔ گورو جی کے سارے بدن میں سنسنی سی تیرنے لگی۔

"روپا۔" گورو جی بولے۔

"میں زبیدا ہوں گورو جی۔"

"نہیں، آج سے ہم تمہیں روپا کہیں گے۔ اس لئے کہ تم سچ سچ روپ وتی ہو۔"

زبیدا نے شرم سے سر جھکا لیا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔

گورو جی بولے۔ "اگر تم منگلیک ہو تو ہم بھی منگلیک ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم نے سارے نکشتر سدھ کئے ہیں۔ ہم پر کسی بُرے گرہ کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ تم ہمارے پاس رہ کر ہمیشہ خوش رہو گی۔"

زبیدا بولی۔ "گورو جی میں نے تو آپ ہی کا آسرا لیا ہے۔ ساری دنیا کی ٹھوکریں کھا کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کے چرنوں کی دھول مل جائے میرے لئے یہی بہت کچھ ہے۔"

"چرنوں کی دھول ہی نہیں، تمہیں ہماری بانہوں کا سکھ بھی ملے گا۔" گورو جی

اتنا کہہ کر زور سے ہنسے اور دیکھا کہ نربدا پر اس کیا اثر ہوا مگر نربدا نے شرم سے گردن نیوڑھا کر پلّو کی آڑ لے لی تھی۔

گوروجی کا سر بھاری ہونے لگا تھا۔ انہوں نے سوچا آج اتنی جلدی مجھے نیند کیوں آ رہی ہے۔ پھر جلدی سے بولے۔ "یہاں ادھر آ جاؤ۔ میرے پاؤں چھوڑ کر میرے ہاتھ دابو۔"

نربدا — گوروجی کو ایسا لگا جیسے ان کے پاؤں سے اٹھ کر ان کی بانہوں تک آنے میں بہت دیر کر رہی ہے۔ بے چین ہو کر بولے۔

"جلدی آ جاؤ تاں ۔۔۔۔ " مگر ایسا کہتے کہتے انہوں نے محسوس کیا جیسے ان کی زبان تتلا رہی ہے۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی نربدا ان کی بانہوں کی طرف چلی۔

گوروجی اب اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا سر بھاری کاسے بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اور جب انہوں نے نربدا کو اپنی بانہوں میں لیا تو وہ مچھلی کی طرح ان کی بانہوں سے پھسل گئی۔ دوسری مرتبہ انہوں نے پھر کوشش کی تو پھر ایسا ہی ہوا۔ تیسری مرتبہ خود بخود ان کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے اور وہ بستر پر لڑھک کر ایک طرف لڑھک کر بیہوش ہو گئے۔

نربدا چند منٹ ان کے پاس بستر پر بیٹھی خاموشی سے گھڑیاں گنتی رہی پھر اس نے جیوتشی جی کے بدن کو سیدھا کیا۔ لالٹین کی روشنی میں ان کی آنکھوں کی پتلیوں کو دیکھا۔ دوا کا اثر اب گہرا ہو چکا تھا۔ اب وہ بارہ گھنٹے اسی بیہوشی کی حالت میں سوتے رہیں گے۔

نربدا نے جیوتشی جی کے کرتے کے پہلے بٹن کھول دیئے۔ اب ان کا گلا صاف نظر آرہا تھا۔ اور گلے میں پڑا ہوا چاندی کا ایک تعویذ بھی کالے ڈورے سے بندھا ہوا۔

نربدا نے آہستہ سے اس کالے ڈورے کی گرہیں کھول کر تعویذ کو نندلال کے گلے سے الگ کیا، پھر فولاد کی ایک پتلی کمانی سے اس چاندی کے تعویذ کو کھولا۔ اس کے اندر سونے کا پترا مڑا تڑا پڑا تھا۔ نربدا نے اس پترے کو اٹھا کر سیدھا کیا اپنی انگلیوں کے زور سے اس کی شکنیں دور کیں۔ پھر لالٹین کے قریب جا کر اپنا اطمینان کیا اور جب اسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ یہ وہی گمشدہ سونے کی کان کے نقشے کا پترا ہے تو وہ اسے اٹھا کر کمرے سے باہر چلی آئی اور باہر آکر اس نے باہر کی کنڈی دروازہ پر لگا دی اور لالٹین لے کر اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

اس نے سوچا اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ سونے کا پترہ اس کے پاس ہے جیوتشی جی بیہوش ہیں .... صبح پو پھٹنے سے پہلے وہ اس گھر سے نکل جائے گی۔ اور جانے سے پہلے جیوتشی جی کا کمرہ کھول دے گی۔ وہ اس کے جانے کے بعد دیر تک سوتے رہیں گے اور جب تک وہ اٹھیں گے وہ میلوں دور جا چکی ہوگی۔ اس نے لالٹین کی بتی نیچے کر دی اور اپنے بستر پر پڑ کر آرام سے سو گئی۔

دھیرے دھیرے جنگل میں چاندنی کی سحر پھیلتی جا رہی تھی۔ آج نرمدا کو تو آسمان بہت سہانا معلوم ہو رہا تھا۔ راوت کے یہاں اور سیٹھ جیوتشی جی کے یہاں اس کی دونوں کوششیں کامیاب رہی تھیں۔ اور ان دونوں جگہوں سے اس نے سونے کے تیرے حاصل کر لئے تھے۔ اب اس کا جی گانے اور گنگنانے کو چاہ رہا۔ گھر سے نکل کر پہلے چند سو گز وہ تقریباً دوڑتی چلی گئی کسی مست ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی۔ اس کے دل میں خوشی کا آبشار سا اتر رہا تھا۔ اگر اسی طرح اسے باقی جگہوں پر بھی کامیابی نصیب ہوتی رہی تو...... تو — آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی۔ دھنک کے سات رنگ اس کی کلپنا میں کھلتے گئے۔ اور اس کی چال میں خود بخود ایک چنچل ادا سی آ گئی۔

اب اسے جلد سے جلد دہرہ دون پہونچ جانا چاہئے اور گاؤں اور بستیوں

سے نہیں گزرنا چاہیے۔ کیا معلوم ہوش آنے پر جیوتشی جی کہاں تک اس کا پیچھا کریں۔ اس لئے اسے وہ راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جو آبادیوں سے نہ گزرتا ہو۔ یوں اس نے اس لئے سوچا کہ عام پگڈنڈیوں اور شاہراہوں سے جیوتشی جی ممکن ہے اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

اب اس کا راستہ گھنے درختوں کی دو رویہ قطار سے گزر رہا تھا۔ دونوں طرف پیڑوں کے چھتناروں نے مل کر ایک سبز محراب بنا ڈالی تھی۔ جس کے اندر سے وہ گانی ہوئی گزر رہی تھی۔

یکایک کوئی کسی گھنے پیڑ سے نیچے کودا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ ٹھٹھک کر دیکھا تو سامنے دلیپ کھڑا تھا۔ ہاتھ میں پستول لئے ہوئے دوسرے لمحے میں نرملا لڑکھڑا کر گر پڑی اور پھسلتی ہوئی اس کے قدموں میں جا پڑی۔ اور یہ اس نے ارادۃً کیا تھا۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگاتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک ایسا چاپ مارا کہ دلیپ شدید درد کے عالم میں گر پڑا اور پستول اس کے ہاتھ سے گر کر دور تک پھسلتا چلا گیا۔ اب پستول ان دونوں کے ہاتھ سے دور تھا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ لڑکی جوڈو اور کراٹے میں خاصی ماہر معلوم ہوتی تھی۔ اور بار بار اپنے آپ کو دلیپ کے وار سے بچا کر اسے ہی لڑھکا دیتی تھی۔ مگر دلیپ کے بدن میں طاقت کی جو بے پناہ شدت تھی۔ اس کا مقابلہ وہ دیر تک نہ کر سکتی۔ ادھر دلیپ بھی اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ورنہ گردن کی گدی پر چاپ کے ایک ہی وار سے وہ اس کی گردن لڑھکا سکتا تھا۔ اس کے بجائے اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کے بدن کو گھیر کر اس کا دم گھٹنے

کی کوشش کی اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گیا اور لڑکی کو اپنا گلا بند ہوتا ہوا محسوس ہوا تو اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے اور دلیپ کی باہوں میں بیہوش ہو گئی۔

دلیپ نے بڑی آہستگی سے لڑکی کو گھاس کے ایک تختے پر لٹا دیا۔ اور اسکی تلاشی لے کر سونے کے پتر برآمد کر لئے مگر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کے پاس سونے کے دو پتر نہیں تھے۔ تین تھے۔

دلیپ نے دائیں بائیں لڑکی کے رخسار پر دو تین طمانچے مارے بہت جلد لڑکی ہوش میں آ گئی۔ ہوش میں آ کر اٹھ بیٹھی۔ مگر ابھی اس کے اوسان بجا نہ ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر اپنی سانس ٹھیک کرتی رہی۔ دلیپ اس کے قریب بیٹھا رہا مگر کچھ بولا نہیں۔

مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی اب مکمل طور پر ہوش میں ہے اور اس کے استعمال سے کسی قدر خوفزدہ ہو رہی ہے۔ تو دلیپ نے مسکرا کر اپنی پتلون کی جیب سے وہ تینوں پتر نکالے اور پوچھنے لگا۔

"یہ دو پتر تو راوت اور جیوتشی جی کے یہاں سے تمہیں ملے ہیں مگر یہ تیسرا پتر کہاں سے ملا۔؟"

"اپنے ڈیڈی سے۔"

"تمہارے ڈیڈی کا نام۔؟"

"پرتاپ رائے۔"

دلیپ کو پرتاپ رائے کا چہرہ فائل سے ابھر کر اس کے ذہن میں آتا ہوا معلوم ہوا۔ پرتاپ رائے بزنس مین۔ سمینٹ فیکٹری کا مالک، صاحب

کی فیکٹری کا مالک، جنگلات کا ٹھیکے دار۔ یعنی دلیپ کا اگلا شکار۔

"تمہارے ڈیڈی نے تمہیں یہ سونے کا پترا کیوں دیا۔؟"

"دیا نہیں، مجھے مل گیا۔"

"کیسے۔؟"

"ان کی موت کے بعد۔....."

"کیا وہ مر چکے ہیں۔؟"

"ہاں۔" نربدا بڑے تلخ لہجہ میں بولی۔ "وہ سمینٹ فیکٹری، وہ صابن فیکٹری، جنگلات کے ٹھیکے سب جوئے کے ایک داؤ میں ہار گئے پھر......"

یکایک وہ چپ ہو گئی۔

"پھر کیا۔؟"

"پھر ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ تب سے میں ان سونے کے پتروں کے پیچھے ہوں۔"

"کیوں۔؟"

"جب وہ مرے تو میں کالج میں پڑھتی تھی۔ بی۔ اے میں۔ میرے لئے زندگی کی ساری آسائشیں تھیں۔ کار۔ بینک بیلنس، زندگی کی سیکورٹی، عزت، سب دھوئیں کی طرح اڑ گیا۔ اس لئے میرے لئے اس سونے کی کان کو دریافت کرنا، بہت ضروری ہے۔"

"کیوں ضروری ہے۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

نربدا نے اپنے خوبصورت ہونٹ سکوڑے، پھر نچلے کا ہونٹ ذرا سا

لٹکا لیا۔ پھر سر جھٹکا کر بڑی بے نیازی سے بولی۔
"مجھے غریب لڑکی بن کر زندہ رہنا پسند نہیں۔ میں ایئر ہوسٹس نہیں بنوں گی رسیپشنسٹ بھی نہیں۔ میرے پتا جی نے جو کچھ کھو دیا، وہ سب میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔!"
لڑکی کے دونوں ہونٹ پھر سختی سے سکڑ گئے۔ اس کی آنکھوں میں عزم صمیم کی جھلک ابھر آئی۔ ..... "وہ سب اس سونے کی کان کو حاصل کئے بغیر تو ممکن نہیں ......"
دلیپ نے ہنس کر کہا۔ "مگر اب وہ تینوں پترے میرے پاس ہیں۔"
لڑکی بولی۔ "میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ میں تمہاری جان لیکر رہوں گی۔"
دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر بات بدل کر بولا۔
"یہ تم نے جوڈو اور کراٹے کے داؤں کہاں سے سیکھے۔؟"
"کالج میں۔"
"سچ۔"
"ہاں۔" نرمدا بولی۔ "آجکل لڑکیوں کے کئی کالجوں میں ہم لوگوں کو اپنی حفاظت کے لئے داؤ سکھائے جاتے ہیں۔"
"اور نرمدا تمہارا اصلی نام ہے۔؟"
"نہیں ...... میرا اصلی نام تو کملا ہے۔ مگر جہاں جاتی ہوں اور جیسا ماحول دیکھتی ہوں، اس کے حساب سے اپنا نام بدل لیتی ہوں۔"

دلیپ نے شرارت سے دو تین بار وہ سونے کے پترے لڑکی کے سامنے جھلائے پھر اس نے ان تینوں پتروں کو لڑکی کی گود میں پھینک دیا۔

لڑکی بالکل بھونچکی رہ گئی۔ سونے کے تینوں پترے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر اس نے انہیں اپنے ابھرتے ہانپتے کانپتے سینے سے لگا لیا پھر حیرت سے دلیپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ایسا تم نے کیوں کیا۔؟"

دلیپ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سونے کے دو اپنے پترے نکالے اور انہیں لڑکی کو دکھا کر بولا۔

"کمل...... یہ دو پترے میرے پاس ہیں ان دونوں کے سہارے میں سونے کی کان کا نقشہ نہیں جان سکتا۔ تم ان تین پتروں کے سہارے سونے کی کان تک نہیں پہونچ سکتیں۔ اس طرح نہ تمہیں کچھ حاصل ہوگا، نہ ہمیں اور اس طرح وہ سونے کا سنسار ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل رہیگا۔ رائیٹ۔؟"

"رائیٹ۔!" کمل بولی

"اس لئے میں چاہتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر کام کریں۔ جہاں میری طاقت ساتھ نہیں کرے گی۔ وہاں تمہارا حسن کام کر جائیگا۔"

"یعنی۔؟"

"یعنی کہ ففٹی ففٹی...... سونے کی کان کا آدھا حصہ تمہارا ہوگا آدھا میرا......"

"آر یو سیریس ۔ Are you serious ؟"
لڑکی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"اگر میں سیریس نہ ہوتا تو تمہیں سونے کے بسکٹ واپس کیوں کرتا۔"
کمل کو کچھ کچھ یقین آنے لگا۔
کافی دیر تک سوچ کر بولی۔ "مگر ایک شرط ہے۔"
"کیا۔ ؟"
"نو لَو۔ No Love ۔!"
"یعنی۔ !" اب دلیپ نے وضاحت چاہی۔
"یعنی لَو وو کو نہیں۔ پریم نہیں، عشق نہیں، محبت نہیں۔ ہم دونوں صرف بزنس پارٹنر ہیں"
"او کے پارٹنر۔" دلیپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔
لڑکی نے اس کے ہاتھ سے ہاتھ ملا کے مصافحہ کیا اور جس مضبوطی سے اس نے دلیپ سے ہاتھ ملایا اس سے دلیپ کو یقین ہوگیا کہ لڑکی آن والی ہے اپنے وعدے کو نبھائے گی۔
دلیپ خوش ہو کر بولا۔ "پانچ بسکٹ ہمارے پاس ہیں۔ اب ہمیں صرف دو بسکٹ اور چاہئیں۔"
"دو نہیں تین۔" لڑکی تیز آواز میں بولی۔
"ہاں تین۔ !" دلیپ نے اقبال کیا۔
"پھر تم نے دو کیوں کہا۔ ؟" لڑکی اس سے جواب طلب کرنے لگی۔

دلیپ بولا۔ "میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔"

پھر وہ زور سے ہنس دیا۔ لڑکی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "امتحان لینا تو فضول ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم نے اپنا ہوم ورک ٹھیک سے یاد کر رکھا ہے۔" دلیپ نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ پھر بولا۔ "تو اب کہاں چلیں گے۔؟"

"پہلے دہرہ دون۔ پھر وہاں سے سیدھے بمبئی۔"

* * *

دہرہ دون پہونچ کر انہوں نے ہوٹل میجسٹک میں قیام کیا۔ ساتھ ساتھ کمرے لئے۔ نہا دھو کر شام کے کپڑے بدل کر جب وہ رات کے کھانے کے لئے ڈائننگ روم کے دروازے تک پہونچے تو یکایک کمل نے دلیپ کو کھینچ کر دروازے کے پیچھے کر لیا۔

دلیپ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے۔؟"

کمل نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ "وہ قریب ہی رکھے ہوئے مائیل پام کے بڑے گملے کی اوٹ سے اندر جھانک کر دیکھو۔"

دلیپ نے جب اس گملے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا تو سامنے کی میز پر چھوٹی تیشی جی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

دلیپ چونک کر کچھ کہنے والا تھا۔ کر رشمی نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

خاموشی سے دونوں الٹے قدموں لوٹ آئے۔ کمل، دلیپ کے کمرے میں جاکر بولی۔

"اب یہاں ایک منٹ کے لئے رہنا ٹھیک نہیں۔"

"تیزی سے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"ہاں۔" کمل بولی۔ "ایک پرائیویٹ ٹیکسی کر لیں گے۔ تم سامان باندھ لو۔ میں بھی باندھ لیتی ہوں۔ دس منٹ کے اندر ہمیں اس ہوٹل سے رخصت ہو جانا چاہئے۔"

دس منٹ میں سامان باندھ لیا گیا۔ کرایہ ادا کر دیا گیا۔ بیل بوائے کو دس روپے ایکسٹرا دے کر وہ دونوں ہوٹل کی عقبی سیڑھیوں سے اتر کر ایک ٹیکسی میں جا بیٹھے ڈکی میں سامان رکھ دیا گیا۔ یہ ایک کالی طاقتور سیڈان گاڑی تھی۔ ڈرائیور وردی پوش تھا۔ اس نے ذرا سا پیچھے گھوم کر پوچھا۔

"کدھر جناب۔؟"

"سیدھے دہلی۔"

دہلی پہونچ کر وہ راج دوت ہوٹل میں ٹھہرے۔ یہ ایک آرام دہ فور اسٹار ہوٹل تھا۔ دونوں نے ساتھ ساتھ لیکن الگ کمرے لئے۔ کناٹ پیلیس کی دوکانوں سے نرملا اور دلیپ دونوں نے اپنے لئے اچھے اسٹائل کے ریڈی میڈ کپڑے لے لئے تاکہ کسی اچھے ہوٹل میں رہنے والے سلیقے کے لوگ معلوم ہوں۔

راج دوت ہوٹل سے دلیپ نے اپنے چچا جسونت سنگھ کو ٹرنک کال بھی کیا اور اسے اب تک ساری واردات بھی سنائی اور کمل کا خاص طور پر ذکر کیا اور اس سے ففٹی ففٹی پارٹنر شپ کا احوال بھی بتایا۔ جسونت سنگھ نے سب احوال سنکر اس کی کارکردگی کو سراہا اور کمل سے پارٹنر شپ کرنے کے معاملے کو ایک ضروری مصلحت یا مجبوری کو سمجھ کر اس پر صاد کیا۔

دلیپ نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس کے پاس روپے کم رہ گئے ہیں اور بمبئی میں

اُسے خاصی رقم درکار ہوگی کیونکہ جس نوعیت کی مشکلات وہاں اسے پیش آنیوالی تھیں ان کے پیشِ نظر زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ اس کے چچا نے اسے بتایا کہ وہ اسے کل ہی پچیس ہزار روپے کا ڈرافٹ راج دوت ہوٹل کے پتے پر روانہ کر دے گا۔ اور اگر اسے اس سے زیادہ ضرورت پڑی تو وہ بمبئی سے اس سے فون پر بات کر کے منگوا سکتا ہے۔

دلیپ نے ٹرنک کال ختم کرنے سے پہلے اپنے چچا سے یہ بھی پوچھا کہ نفتیش کے مکمل ہو جانے کے بعد کیا پروگرام ہوگا۔ اور وہ ___ اس کا چچا ___ اس سے کہاں اور کیسے ملے گا۔ اس پر جسونت سنگھ نے کہا۔ "اس کی تم فکر مت کرو۔ تم معاملات سے مجھے آگاہ کرتے رہنا۔ میں تمہیں خود مناسب جگہ پر آ کے مل جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر چچا نے کال کٹ کر دیا۔

ڈرافٹ ملنے کے بعد بھی دلیپ اور کمل دلی میں آٹھ دن رہے۔ ان دنوں میں وہ دونوں زندگی کی ایک اونچی سطح پر آ گئے تھے۔ مالی اعتبار سے ان کا لباس، رہن سہن کا طریقہ، چلنے پھرنے کے انداز، گفتگو کا مزاج، سب کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ نوکر پیشہ لوگوں کی سطح پر نہیں تھے۔ اس ماحول میں جسونت سنگھ، دلارے اور ملاوت اگر انہیں دیکھتے بھی پہچان نہیں سکتے تھے۔

بمبئی کے لئے دلیپ نے اسکا انیڈ مصطفےٰ حسین سے دو بہترین سوٹ سلوائے کمل کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ اس لئے دلیپ سے اس نے پانچ ہزار روپے اُدھار لے لئے۔ کچھ رقم تو وہ اپنے ملبوسات پر بمبئی میں خرچ کرے گی اور کچھ رقم سے وہ گبریلا اور ماری روز کی لیڈیز ٹیلرز سے دو تین عمدہ میکسی اور پلا ؤز خرید لے گی اور عورتوں کے سنگھار اور میک اپ کے لئے چند ضروری اشیاء۔ مگر ملبوسات کے لئے اصل خریداری

باہر ہی ہوگی۔ دلی سے کچھ خریداری اس لئے ضروری تھی کہ انہیں باہر جاکر تاج انٹرنیشنل میں ٹھہرنا تھا۔

آٹھ دن بعد صبح کی پہلی فلائیٹ پکڑ کر وہ پالم سے سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر اُتر گئے۔ دونوں غور سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ مگر کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں آئی۔ لگتا تھا کہ وہ جل دینے میں کامیاب ہو گئے۔

ہوائی اڈے پر ایک پرائیویٹ ٹیکسی ان کے لئے حاضر تھی۔ دلیپ نے رات دوت سے تاج انٹرکانٹی نینٹل کو فون کر دیا تھا۔ وہاں سے سیدھے وہ تاج میں پہونچ گئے۔

پھر دو کمرے ساتھ ساتھ لئے گئے۔ کمرہ نمبر 210/211 اور یا رہ سو گیارہ یعنی بارہویں منزل اور کمروں کے نمبر دس اور گیارہ۔ دیلانتا دیوار پھولدار غالیچے اور محراب نما کھڑکیاں صاف ستھرے مغربی ٹوائیلٹ اور صوفوں کے ساتھ گدے والے تخت مغربی اور مشرقی تکلفات کا امتزاج پیش کرتے تھے۔

شیو اور شاور کے بعد پھر کپڑے بدل کر ان دونوں نے اکٹھے دلیپ کے کمرے ہی میں لنچ لے لیا۔

لنچ سے پہلے وہ دونوں باری باری مول چند نواس کا طواف کر آئے تھے جو ہینگنگ گارڈن کے قریب بائیں طرف دو منزلہ محل نما بنگلہ تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی دیوار کھینچی ہوئی تھی۔ اور اندر جانے کے لئے ایک اونچا آہنی جالی دار دروازہ تھا۔ جس پر دو دربان ہمیشہ کھڑے رہتے تھے۔

پہلے کمل نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

"میں ایک نوکرانی کے لباس میں گئی تھی۔ مگر وہاں پر کسی نوکرانی کی جگہ خالی

ہے۔ نہ کسی آیا کی، نہ باورچی کی، نہ جھاڑ پونچھ کرنے والی کی۔ ٹکا سا جواب ملا۔ خالی ہاتھ لوٹ آئی۔"

اتنا کہہ کر وہ دلیپ کی طرف دیکھنے لگی جیسے اس سے کسی مدد یا مشورے کی خواہاں ہو۔

دلیپ نے مسکرا کر کھانے کی پلیٹوں کی طرف اشارہ کیا: "کھانا شروع کرو۔"

"تم اپنا قصّہ بتاؤ کیا ہوا۔؟"

دلیپ بولا۔ "میرا قصّہ تقریباً وہی کچھ ہے جو تمہارا ہے۔ وہاں مول چند کو اس میں نہ کسی موٹر ڈرائیور کی ضرورت ہے، نہ مالی کی، نہ گھر کے نوکر کی۔ نہ ٹیلر کی۔ نہ جوتے صاف کرنے والے کی۔"

"تو لگتا ہے ہمارا پلان یہاں کامیاب نہیں ہوگا۔؟"

دلیپ بولا۔ "اتنی جلد کا ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اتنا معلوم ہو چکا ہے کہ سونے کی کان کا وہ ہیرا مگن لال شاہ کے پاس موجود تھا۔ مگر دو سال ہوئے اس کی موت ہوگئی اور اب ظاہر ہے وہ ہیرا اس کے اکلوتے بیٹے مول چند کے پاس ہوگا۔"

"پھر۔؟" کملا نے پلاؤ کی قاب سے چند چمچے پلاؤ کے اپنی پلیٹ میں ڈالے اور اُن پر فرائی پیاز والا روغن جوش چھڑک کر پوچھا۔

دلیپ نے کملا کی طرف دیکھ کر شریر نگاہوں سے اسے تاکتے ہوئے کہا۔

"میں نے معلوم کر لیا ہے کہ سیٹھ مگن لال شاہ کا اکلوتا بیٹا مول چند شاہ دونوں ہاتھوں سے اپنے باپ کی دولت لٹا رہا ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کے لئے وہ ایک پلے بوائے ہے۔ اور پلے بوائے کی ایک ہی کمزوری ہوتی ہے۔ عورت۔! سمجھ گئیں۔؟"

"ہاں۔" کملا کانٹا ڈال کر پلاؤ سے کھیلنے لگی۔ پھر اس نے بڑی نزاکت سے کانٹے پر پلاؤ کا آدھا چمچ ڈال کر اسے اپنی زبان پر رکھ لیا۔

دلیپ اس کے پتلے سرخ باریک کٹے ہوئے ہونٹوں کو ہلتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

"ایک الجھن اور بھی ہے۔" دلیپ نرگسی کوفتے کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا۔!" کملا نے پوچھا۔

"وہ عجیب قسم کا پلےبوائے ہے۔ اسے غیر شادی شدہ عورتوں سے کوئی بھی دلچسپی نہیں۔ وہ صرف شادی شدہ عورتوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ اور صرف ان سے ہی کھیلتا ہے۔ جن کی عمر تیس سے کم ہو۔"

کملا بولی۔ "عمر تو میری تیس سے کم ہے مگر میں شادی شدہ نہیں ہوں۔"

دلیپ نے کہا۔ "اس کا حل تو حاضر ہے۔ ہم دونوں یہاں کی ہائی سوسائٹی میں ایک شادی شدہ جوڑے کی طرح گھوم سکتے ہیں۔ یعنی بظاہر......"

"ہاں یہ تو ہو سکتا ہے۔" کملا سوچتے ہوئے بولی۔ اور جب وہ سوچ میں پڑ جاتی تھی تو اس کی کمان کی طرح کھنچے ہوئے ابرو کے عین بیچ الف کا سا نشان بڑی ہی خوبصورتی سے ابھرتا تھا۔

پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "اگر کہیں موتی چند نو اس میں نہیں یا مجھے کسی نوکر کی جگہ مل جاتی تو معاملہ کتنا آسان ہو جاتا۔"

"اس حل کو دل سے نکال دو۔" دلیپ بولا۔ "وہ معاملہ نہ تمہارے بس کا ہے نہ میرے بس کا۔ اب تو یہی ترکیب ہو سکتی ہے کہ ہم لوگ تاج انٹرکانٹی نینٹل میں رہیں۔

اپنے آپ کو ایک امیر جوڑا ظاہر کریں اور تم اس کا دل بہلا کے اسے اپنی طرف مائل کرو......
یہ کام اب میرے بس کا نہیں رہا۔

"He is your cup of tea"

"مگر تاج میں رہ کر خرچ کس قدر ہوگا۔ یہ بھی سوچا ہے۔؟" کمل نے دلیپ سے پوچھا۔

دلیپ بولا۔ "ابھی کافی رقم میرے پاس ہے۔ ختم ہو گئی تو چچا جسونت سنگھ سے منگا لوں گا۔"

جسونت سنگھ کا نام سن کر کمل ایک بار چونکی، پھر اس کی نگاہیں پلاؤ کی قاب پر ساکت ہو گئیں۔

دلیپ بولا: "ایک مشکل اور بھی پیش آ سکتی ہے۔"

"وہ کیا۔؟" کمل نے پوچھا۔

دلیپ کی نگاہوں میں شرارت تھی۔

بولا۔ "اب تک تم نے ایک جہازی کی جیوتشی کا دل بہلایا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے بابجے کا یہ حسن اور خوبرو بیٹے پوانے جو ہر روز ایک سے ایک بڑھیا حسینہ سے کھیلتا ہے تمہاری طرف ملتفت نہ ہو۔ ممکن ہے وہ تمہیں خوب صورت ہی نہ سمجھے۔"

جواب میں کمل نے بھرے چاولوں کی قاب دلیپ پر الٹ دی۔ دلیپ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

دلیپ نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ مول چند شاد شام کی چائے اکثر تاج انٹرکانٹی نینٹل کے لاونج سے ملحق "شامیانہ" ریستوران میں پیتا ہے۔ لنچ اکثر گھر پر کھاتا ہے اور اگر کوئی بڑی پارٹی نہ ہو تو ڈنر عام طور پر تاج کے "راندیوو" میں یا اوبرائے شیراٹن کے "مغل روم" میں یا آؤٹ رگرز میں کھاتا ہے۔ جہاں عمدہ پالی نیشین کھانا ملتا ہے۔

طے یہ پایا کہ آج شام کی چائے "شامیانہ" میں پی جائے۔ ساڑھے چار بجے کے قریب جب کمل سج کر دلیپ کے کمرے میں آئی تو دلیپ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اور ٹھٹک کر ٹھٹھک گیا اور ٹھٹک کر عجیب حیرت اور شادمانی کے ملے جلے احساس سے کمل کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ یوں تو خوب صورت عورت ہر حالت میں خوب صورت ہی رہتی ہے۔ لیکن سلیقے کے سنگھار اور سج دھج کے بعد اس کے حسن اور دلربائی میں چار چاند کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ بے حد خطرناک ہو جاتی ہے مرد جو کام اپنے دماغ

سے لیتا ہے ۔ عورت اپنے جسم سے لیتی ہے ۔ اس لئے اگر وہ اپنے جسم کی دلکشی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو کسی طرح بیجا نہیں ہے ۔ ہر شخص اپنے کا ہزآمد ہتھیار کو سینت سنبھال کے رکھتا ہے ۔

میک اَپ سے کمل کی پلکیں اور کتنی لانبی ہوگئی تھیں ۔ اور ان لانبی پلکوں کے اندر اس کی گہری سیاہ آنکھیں کتنی بڑی بڑی دکھائی دے رہی تھیں ۔ جیسے اتھاہ جھیلیں ۔ بالوں میں پھول ، ہاتھوں میں گجرا اور سفید بروکیڈ کی فراک پر سبز ریشم کے لہریے کتنے حسین معلوم ہوتے تھے ۔ لانبی گردن میں سچے موتیوں کی دمکتی مالا اور ہاتھ میں سفید بروکیڈ ہی کا پرس ۔ یقیناً دلیپ اسے دیکھ کر لڑھک گیا تھا ۔ اسے اب تک معلوم نہیں تھا کہ کمل اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتی ہے ۔ حسین فضا ۔ حسین موڈ ۔ حسین ملبوس اور حسین خوشبو کے ماحول میں عورت کا حسن بے حد نکھر جاتا ہے ۔ اب تک وہ کمل کے حسن کے جادو سے اگر کچھ بے خبر سا رہا تو اس میں کچھ قصور خود کمل کا بھی تھا ۔ ایسا میک اَپ ۔ ایسا سنگھار ایسا فاخرانہ لباس اس نے دلیپ کے سامنے آج تک اختیار نہیں کیا تھا ۔

دلیپ جب ذہنی طور پر لڑھکا تو دور تک اور دیر تک لڑھکتا ہی گیا ۔ پھر جیسے ہوش میں آیا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ برابر کتنی دیر سے کمل کو انتہائی حماقت سے تکتا چلا جا رہا ہے ۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اپنے آپ کو روکنا چاہیے ۔ اس لڑکی کے ساتھ عہد و پیمان صرف بزنس کا ہے ۔ محبت کا نہیں ۔ اس لئے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ۔

" کیوں ۔ ؟ " کمل نے سوال کیا ۔ گویا کہہ رہی ہو ۔ " اب کہو ۔ "

اور یہ کل کے اس جملے کا جواب ہے ۔ دلیپ نے سوچا جب اس نے کمل کے حسن کی طاقت کو بیکار کہہ کر چیلنج کیا تھا کہ ممکن ہے مول چند شاہ تمہیں خوبصورت ہی نہ سمجھے ۔ ؟ اس لئے آج کمل نے دلیپ کی حسِ لطیف پر بھرپور وار کیا تھا ۔

"بُرا نہیں۔ بُرا نہیں۔" دلیپ نے اپنے آپ کو روکتے ہوئے کہا، کہ کہیں زیادہ تعریف سے کمل کا دماغ نہ پھر جائے۔ پھر کمل کے چہرے پہ بیزاری کے تاثرات پیدا ہوتے دیکھ کر بولا۔

"سچ پوچھو تو میرے اندازے سے تم کہیں بہتر نکلیں۔"

اس جواب سے کس قدر کمل کو تسلی ہوئی۔ دلیپ جان نہ سکا۔ کیونکہ خود کمل اب اسے دوسری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پیچھے کی طرف گھومے ہوئے گھنے بال، روکا کا بھوری دھاریوں والا سوٹ اور اس پر گلپوش ٹائی اور ٹوسکا کے قیمتی کف لنکس اور بھوری برو گیسک کے جوتے اور سر سے پاؤں تک تنا ہوا جوان جسم۔ ایک ایسی خفتہ توانائی سے بھرپور جس نے کمل کے سارے جسم میں سنسنی سی پھیلا دی تھی اور لطیف احساس کی پھریریاں اسے بار بار گویا دلیپ کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ کمل نے بھی اپنے آپ پر جلد قابو پا لیا۔ میرا اس کا رشتہ ہی کیا ہے۔ بس ایک بزنس کا۔ پھر اس کا راستہ الگ اور میرا الگ۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو روکتے ہوئے بھی بے اختیار اس کے قریب چلی گئی۔ اپنے جسم کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے اس نے دلیپ کی ٹائی کو ٹھیک کیا۔ گویا اگر وہ اس کے قریب آئی تھی تو صرف اس کی ٹائی ٹھیک کرنے کے لئے۔ ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ "ٹائی باندھنے کا سلیقہ تو سیکھو۔" اور یہ بھی اس لئے کہا کہ کہیں دلیپ، کمل کے اندرونی جذبے کی بے چینی کا راز نہ پا جائے۔

پھر کمل نے دلیپ کے بازو کا سہارا لیا اور وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ لفٹ سے اتر کر نیچے "شامیانہ" میں جا کر ایک میز پر جا بیٹھے اور کمل بے حد رئیسانہ انداز سے شیکس سے بھری شرابیں سے سنیکس پسند کرنے لگی۔

اتنے میں مول چند شاہ اندر آیا۔ دلیپ اور کمل نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس کا قد لانبا تھا۔ بھرا بھرا جسم۔ کسرت سے عاری۔ گندمی رنگت۔ سیاہ بالوں میں چھلے پڑے تھے۔ جو کچھ عورتوں کو بے حد پسند آتے ہیں۔ منہ میں ایک موٹا سگار تھا۔ اس نے داخل ہوتے ہی چاروں طرف نگاہ ڈالی پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر غور سے چاروں طرف دیکھا۔ کچھ مایوس سا ہو کر جانے والا تھا۔ کہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنی ٹیبل سے اٹھ کر اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

"ہیلو، رابی۔" اس آدمی نے کہا۔

مول چند نے ہاتھ کے اشارے سے اس آدمی کو ہیلو کہا اور اس کی ٹیبل پر چلا گیا۔

"یہ رابی کون ہے۔؟" کمل نے دھیمی سرگوشی میں دلیپ سے پوچھا۔

"یہ مول چند شاہ کا نک نیم (Nick Name) ہے۔ اس کے قریبی دوست احباب اسے رابی کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"تم نے خاصی معلومات اس لڑکے کے متعلق اکٹھی کر لی ہیں۔" کمل نے دلیپ سے کہا۔

"ایسے کاموں میں کبھی اطلاع کی ایک دھجی بھی کار آمد ہوتی ہے۔"

مول چند ان کی ٹیبل سے دو ٹیبل پرے بیٹھا تھا مگر اتفاق سے کچھ اس طرح بیٹھا تھا کہ وہ کمل کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک بار وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ ایک بار تو برابر کئی لمحوں تک اُسے گھورتا رہا مگر دلیپ اور کمل نے ایسا ظاہر کیا جیسے ان دونوں نے اُسے بالکل دیکھا نہ ہو بلکہ شامیانے میں اس کی موجودگی سے بھی بے خبر ہوں۔ حالانکہ

جس طرح جھک جھک کر سٹوارٹ اسے سلام کر رہا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مول چند شاہ شامیانے کا مستقل گاہک ہے۔

کچھ عرصے کے بعد کمل اپنی سیٹ سے اٹھی اور اپنا فراک جھلاتی ہوئی اور کمر لچکاتی ہوئی شامیانہ سے باہر چلی گئی۔ اس کی ٹیبل پر ابھی تک اس کا سفید ٹرکیڈ کا پرس رکھا تھا۔ جس سے مول چند شاہ اتنا تو معلوم کر سکتا تھا کہ یہ لڑکی غالباً ٹائیلٹ میں گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ اور ہوا بھی یہی۔ اب کے جو کمل واپس آئی تو مول چند اسے سامنے سے دیکھ سکتا تھا۔ اور جو کچھ اس نے دیکھا وہ اسے لڑھکانے کے لئے کافی تھا۔ صرف اتنے ہی نہیں آس پاس کے آدھی درجن میزوں سے کمل کے لئے تعریفی نگاہیں اٹھیں اور ان میں کئی خواتین کی جلسی ہوئی نگاہیں بھی شامل تھیں۔

"غضب کی لونڈیا ہے۔" ادھیڑ عمر کے مرد نے مول چند شاہ سے کہا۔

"ام" کہہ کر مول چند چپ ہو گیا۔ اپنے موٹے سگار کو اپنے ہونٹوں میں گھمانے لگا مگر بار بار کمل کو تکے جا رہا تھا اور کمل اور دلیپ دونوں بلیک فارسٹ پیسٹری کی بالائی بھری تہوں میں کانٹا گھما کر اسے مزے مزے سے کھا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد دلیپ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو منٹ بعد ہی مول چند شاہ نے فیصلہ کیا اور اپنی ہیروں والی انگوٹھی گھماتا ہوا اپنے دوست کی ٹیبل سے اٹھا اور کمل کی ٹیبل پر آکے بولا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔؟"

کمل نے گویا پہلی بار مول چند شاہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر

بڑی نخوت سے بولی۔ "سارجا۔ اس ٹیبل پر میرے شوہر بیٹھے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہونگے۔"

"ساری۔!" مول چند شاہ ایک مصنوعی مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔

"نقصان میرا ہی ہے۔ میں نے سمجھا۔ ایک اس قدر حسین اور دلربا لڑکی اکیلی بیٹھی ہے۔"

کمل نے اپنے ہونٹوں پہ ایک چوتھائی انچ مسکراہٹ لاکر کہا۔

"ساری۔ مگر میرے شوہر اب آتے ہی ہوں گے۔ لیجئے وہ آگئے۔"

"یس ڈارلنگ۔!" دلیپ نے آتے ہی سوالیہ نگاہوں سے مولچند شاہ کی طرف دیکھا پھر کمل کی طرف......

"یہ صاحب مجھے کمپنی دینا چاہتے تھے۔ یہ سمجھ کر کہ میں شاید یہاں اکیلی بیٹھی ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں۔" دلیپ فراخدلی سے بولا۔ "آپ اس میز پر بیٹھ سکتے ہیں۔ مسٹر۔؟"

مولچند نے اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام مول چند شاہ ہے مگر میرے دوست مجھے "رابی" کہتے ہیں۔"

دلیپ بولا۔ "مجھے دلیپ سنگھ کہتے ہیں۔ یہ میری بیوی ہیں۔ کمل۔"

کمل ذرا سا سر جھکا کر مول چند کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرادی۔

مول چند دلیپ کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک ایسے زاویئے سے جہاں سے وہ کمل کو اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ اوڈرائے 37 نمبر کی جنگلی مہک کمل کے ملبوس سے آرہی تھی۔ مول چند نے کمل کے فراک کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ صرف

یہ فراک بھی ڈھائی ہزار میں تیار ہوا ہو گا۔

مول چند بولا۔ "آپ لوگ غالباً بمبئی میں نئے ہیں۔؟"

دلیپ نے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیسے جانا۔؟"

"بمبئی میں جتنے حسین اور معقول جوڑے ہیں وہ سب کبھی نہ کبھی ہفتہ دس دن میں تاج یا اوبرائے شیراٹن آتے رہتے ہیں۔ سب سے ملاقات نہ ہو۔ تب بھی آنے جانے والے چہروں سے جان پہچان تو ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان چہروں کو آج تک نہیں دیکھا۔

کمل ہنس دی اور اس کے دانتوں کے موتیوں کی لڑی مول چند کی نگاہوں میں کوند کوند گئی۔

کمل نے ہنس کر کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔ ہم لوگ بمبئی میں نووارد ہیں۔ پرسوں نیکاک سے آئے ہیں۔"

"ٹورسٹ۔؟" مول چند نے پوچھا۔

"نہیں۔" کمل بولی۔ "کچھ عرصے تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔"

"بزنس۔؟" مول چند نے اپنے چہرے کا رخ دلیپ کی طرف کیا۔

"ہاں۔!" دلیپ نے سر ہلایا۔

کمل بولی۔ "میرے شوہر نے جوڈو، کراٹے، تیر اندازی، شمشیر زنی فینسنگ (Fencing) کے کھیلوں میں بڑی مہارت حاصل کی ہے۔ وہ یہاں بمبئی میں کسی اچھی جگہ ایک ہال لے کر جسمانی ورزش کا ایک اسکول کھولنا چاہتے ہیں۔"

"گڈ۔" مول چند، دلیپ کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔ "مجھے کسی

جسمانی ورزش کا شوق نہیں سوائے ایک کے۔ مگر یہاں آپ کو ہزاروں جوان ایسے مل جائیں گے جو امیر طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور خاصی فیس دینے کو بھی آمادہ ہیں یہی سب کچھ سیکھنے کے لیے۔ فلموں نے اس شوق کو اور تیز کر دیا ہے۔ مگر مجھے تاش ڈرائیونگ کے علاوہ اس قسم کا اور کوئی شوق نہیں۔ ہاں اِدھر تاج کے پیچھے مسٹر اور مسز بارڈ یحر کا فزیکل کلچر سکول ہے۔ وہاں سے آپ کو خاصی معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ آپ لوگوں نے کہاں قیام کیا ہے۔؟"

"یہیں تاج میں۔" دلیپ بولا۔

"یہیں تاج میں۔؟" مول چند نے دوہرایا۔ "ویری گڈ۔ میں تو تقریباً روز ہی اِدھر آتا جاتا رہتا ہوں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ کون سا کمرہ۔؟"

"سوئیٹ نمبر 1215۔" دلیپ بولا۔

تو مول چند نے اندر کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر دلیپ کو دیا۔ یہ مول چند کا تعارفی کارڈ تھا۔ پھر اٹھتے اٹھتے بولا۔

"آج شام کا کھانا اگر آپ کو فرصت ہو تو ـــــ میرے ساتھ کھائیے" راونڈے وو میں۔ مغربی فرانس کا ایک ماہر باورچی آیا ہے۔ کیا مزیدار فرانسیسی کھانے تیار کرتا ہے۔ مشہور گانے والی گلوریا کے نغمے۔ پھر آپ اور آپ کی چارمنگ وائف کی کمپنی۔ بلطف آجائے گا۔"

دلیپ نے جیب سے اپنی ڈائری نکالی اور مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔ "آج کا ڈنر تو خالی نہیں ہے۔"

"تو کل سہی۔"

دلیپ نے ورق الٹا۔ پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔

"کل بھی نہیں۔"

"پرسوں یہ دلکش جوڑا کیا کر رہا ہے۔؟" مول چند نے ہمت نہیں ہاری۔

"ہاں۔" دلیپ نے ڈائری دیکھ کے بتایا۔ "پرسوں خالی ہے۔"

"رائیٹ۔" مول چند دلجمعی سے بولا۔ "پرسوں شام سے آپ میرے ساتھ ہیں۔ چائے بھی اکٹھے پئیں گے۔ پھر کوئی فلم دیکھیں گے۔ اس کے بعد۔ راندے ووُ، بیج کھانا۔ رائیٹ؟"

"رائیٹ۔!" دلیپ مسکرا کر بولا۔ اور کمل نے بھی ہاتھ اٹھا کے ذرا سا اسے ہلا دیا۔ تو اس کا سفید بروکیڈ کا پرس ٹیبل سے نیچے جا گرا۔ جلدی سے مول چند شاہ نے اسے اٹھا کر کمل کو دیا۔ دونوں کے ہاتھوں کا لمس ایک دوسرے میں بیدار ہوا۔ بس ضرورت سے ایک دو لمحے زیادہ مول چند شاہ کی انگلیوں کا لمس کمل کی انگلیوں پر رہا۔ پھر الگ ہو گیا۔ کمل کے لمس میں کسی قسم کی مزاحمت نہ تھی۔ تو کسی قسم کا بلاوا بھی نہ تھا۔ مگر ان کے ٹیبل سے واپس اپنے دوست کے ٹیبل پر جاتے ہوئے مول چند کو خیال آیا کہ اس لمس میں اگر کوئی بلاوا نہیں تھا تو مزاحمت کی رد بھی تو نہیں تھی اور پہلی ملاقات میں یہی کیا کم ہے۔!

جب وہ دلیپ کی میز سے اٹھ کر اپنے دوست لکھبیر کی میز پر پہونچ گیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا تو میز کے نیچے لکھبیر نے اس کے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر کہا۔ "یہی تو تمہاری خوبی ہے۔ بہت تیزی سے کام کرتے ہو۔!"

"ہاں۔ میں گھاس اگنے نہیں دیتا۔" مول چند نے انگریزی میں کہا۔

"مگر لگتا ہے" لکھبیر بولا۔ "یہاں تمہاری دال گلنے والی نہیں ہے۔ یہ جوڑا ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

"تم غلطی پر ہو۔" مول چند بولا۔ "لڑکی ہنستی خوشبوؤں اور مہنگے ملبوسات کی قائل معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا شوہر میاں بابے میں نوجوانوں کو پہلوانی کے داؤ سکھانے کا اسکول کھولنے آیا ہے۔ اس کام میں روپیہ کدھر ہے۔ بنکاک سے جو کچھ کما کے لایا ہوگا یہاں چند مہینوں میں چٹنی ہو جائے گا۔ پھر اپنا راج ہے۔"

لکھبیر بولا۔ "مگر لڑکا خاصہ مضبوط اور قبول صورت ہے۔"

"اس میں کوئی شبہ نہیں۔" مول چند بولا۔ "مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ لڑکی کے شوق مہنگے ہیں اور محبت تو شطرنج کی چال ہے، میرے بھائی جس نے داؤ اچھا مارا وہ جیت گیا۔"

لکھبیر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "تم بھی خوب چیز ہو۔ لوگ محبت میں ڈوبتے ہیں۔ تم محبت سے کھیلتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ آج کا کیا پروگرام ہے۔؟"

"جو پروگرام ہے، تمہارے ساتھ ہے۔ شو کے بعد مس گلوریا اور وان ٹون رستوران میں رقص کرنے والی چنچل دونوں میرے گھر پہ آئیں گی۔" اتنا کہہ کر اس نے لکھبیر کو آنکھ ماری۔

* * *

اُدھر دلیپ کمل سے کہہ رہا تھا۔ "شروعات تو اچھی رہی۔"

"ہاں۔" کمل سر ہلا کر بولی۔ "ورنہ ممکن تھا۔ تعارف حاصل کرنے میں کئی دن لگ جاتے۔"

"اور یہ بھی ممکن تھا کہ بالآخر ہمیں ہی تعارف حاصل کرنا پڑتا۔ اب تعارف کا سلسلہ اس سے شروع ہوا اور جہاں ہم چاہتے تھے۔

کمل نے کچھ جواب نہ دیا۔ چائے کا ایک چھوٹا سا سپ لیا۔

دلیپ نے کہا۔ "بالکل لڑھک گیا تم پر۔ فلیٹ۔!"

کمل نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرے ساتھ یہی ہوتا ہے یا تو تمہاری طرح کوئی خیال نہیں کرتا یا پھر بالکل لڑھک جاتا ہے۔ فلیٹ۔!"

دلیپ کو یہ فقرہ سن کر ایک طرح کی خوشی ہوئی اچھا ہے اس لڑکی کو میرے دل کی بدلتی ہوئی حالت کا اندازہ نہیں ہے۔ ورنہ مجھے بھی فلیٹ کر دیتی۔

کمل بولی۔ "اب کیا پروگرام ہے۔ رات کا ڈنر ہم کس کے ساتھ کھا رہے ہیں۔؟"

"کہیں نہیں۔ اپنے کمرے میں۔ دونوں اکیلے۔ پھر تم اپنے کمرے میں۔ میں اپنے کمرے میں۔"

"تو اس وقت کیا کریں۔؟ کوئی فلم دیکھیں۔؟"

"نہیں۔ میں سوچتا ہوں۔ تم اکیلی کوئی فلم دیکھ آؤ۔ میں مسٹر اور مسز ہارڈیکر کا فزیکل کلچر اسکول دیکھنے جاتا ہوں۔"

کمل نے ناک سکوڑ کر اپنی بیزاری کا اعلان کیا۔ بل ادا کر کے دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

کمل نے چلتے چلتے کنکھیوں سے دیکھا۔ مول چند شاہ اور اس کے دوست نے چائے پینا بند کر دیا تھا۔ اب ان دونوں کے ہاتھوں میں کپواری کے گلاس تھے۔

اور وہ دونوں اسے اپنی نظروں سے کھا رہے تھے۔ حالانکہ اس کی پیٹھ

آن دونوں کی طرح سخت۔ پھر بھی کمل کو برابر یہ احساس رہا۔ شاید عورتیں پیچھے سے بھی دیکھ سکتی ہیں۔ ان کے کندھے میں بھی کوئی تیسری آنکھ لگی رہتی ہے ——

شاید...... !

○

ہارڈ ویئر فزیکل کلچر اسکول تاج کے پیچھے نور شاہ بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور میں واقع تھا۔ پہلے ایک نیم تاریک کوریڈور۔ پھر ایک کیبن نما دفتر۔ اس کے آگے جا کے ایک بڑے ہال کا دروازہ۔ اور ہال نیون روشنیوں کی سپیدی سے بھرپور۔

ہال بہت بڑا تھا۔ اور اس میں دو درجن سے زیادہ مرد اور عورتیں ورزش کر رہے تھے۔ زیادہ تعداد غیر ملکی مردوں اور عورتوں کی تھی مگر کچھ ہندوستانی بھی تھے۔ کوئی تیس فیصدی کے قریب اور کسی اسکرین کا استعمال کئے بغیر ہال کے دو حصے کر دیئے گئے تھے۔ داخل ہوتے ہی ہال کا آدھا حصہ مردوں کے لئے وقف تھا۔ اور آخری حصہ جس کی کھڑکیوں کا رخ تاج کی طرف تھا وہ عورتوں کی ورزش کے لئے تھا۔ مردوں کے لئے دو پیرلل بار تھے۔ ڈمبل جیسٹ اکسپینڈر۔ مگدر۔ ٹانگوں کے پٹھوں کی ورزش کے لئے فکسڈ سائیکلیں۔ اور تیراندازی کا سامان۔ عورتوں کے حصے میں ایک پیرلل بار تھا۔ تیر کمان اور طغراۓ۔ فلائنگ

کرنے اور گوشت اور چربی کم کرنے کی بجلی کی مشین ۔ لوہے کا جھولا ۔ اور دونوں حصوں کے بیچ ایک مدور خالی جگہ پہ لکڑی کا برادہ بچھا ہوا تھا ۔ اس پر فینسنگ ہو رہی تھی ۔ اور جوڈو اور کراٹے کی ورزشیں بھی یہیں سکھائی جاتی تھیں، اور یہ حصہ مردوں اور عورتوں کیلئے باری باری استعمال ہوتا تھا ۔ مسٹر ہارڈیکر کا چہرہ سانولا اور ملیح تر تھا ۔ بال گردن سے ذرا اوپر باب فیشن میں کٹے ہوئے ۔ اس نے کریم کلر کا نائلان سٹریچ سر سے پاؤں تک پہنا ہوا تھا ۔ جس میں اس کا ابنا گٹھا ہوا ورزشی بدن کسی مادہ چیتے کے بدن کی طرح لچکتا ہوا ۔ دلیپ نے سوچا ۔ زیادہ ورزش کرنے والی عورتوں میں کوئی ایک چیز کم ہو جاتی ہے ۔ جسم کا ہر زاویہ اپنی جگہ درست اور موزوں ہے مگر نہ جانے کوئی ایک شے لطیف غائب ہے ۔ جو مرد کو عورت کی طرف ملتفت کرتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں ورزش نہ کریں مگر اتنی زیادہ کسرت بھی ٹھیک نہیں ۔ دھیرے دھیرے زیادہ ورزش کرنے والے مرد اور عورت ایک سے معلوم ہونے لگتے ہیں ۔

مسٹر ہارڈیکر نے دلیپ کو داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ ہارڈیکر کا قد اپنی عورت سے کوئی دو انچ کم ہوگا ۔ مگر قد کی کمی کو اس نے اپنے گٹھے ہوئے بدن کی طاقت اور اپنے جسم کے پٹھوں کی غیر معمولی مضبوطی اور چستی سے پورا کر لیا تھا ۔ وہ گہرے گندمی رنگ کا چوڑے جبڑوں والا آدمی تھا جسے ورزش کرتے وقت آسانی سے پسینہ نہیں آتا تھا ۔ اس وقت وہ ایک سفید رنگت والے یوروپین نوجوان کو متوازی بار پر الٹا کھڑا کر کے ورزش کی مشقوں میں سے گزار رہا تھا ۔ اور وہ نوجوان بار بار غلطی کرتا تھا ۔ کیونکہ اس کا پیٹ ذرا آگے کو بڑھا ہوا تھا اور شاید کثرت شراب نوشی سے بازوؤں میں سکت نہیں رہی تھی ۔

دیپ، ہارڈیکر کے قریب کھڑا ہو کر یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر لڑکیوں کے پردے والے حلقے کے باہر کھڑا ہو کر وہ نوجوان کو فینسنگ کرتے دیکھتا رہا۔ ان کو سکھانے والا شاید ہارڈیکر کا بیٹا یا کوئی رشتہ دار تھا کیونکہ سکھانے والے کی شکل ہارڈیکر سے ملتی جلتی تھی۔ پھر آگے بڑھ کر عورتوں والے حصے سے ذرا الگ ہٹ کر ایک بے حد متناسب جسم رکھنے والی جوان عورت کو پیرلل بار پر انتہائی پھرتی اور فن کاری سے اس ورزش کی مشکل ترین مشقوں میں سے کامیابی کے ساتھ گزرتے دیکھتا رہا۔ لگتا تھا یہ عورت سفید موم کی بنی ہوئی ہے۔ جدھر چاہتی تھی اپنے بدن کو گھما لیتی تھی۔

عورتوں کے حصے میں دائیں طرف دو مراٹھی لڑکیاں دو دو چوٹیاں جھلاتی ہوئی تیر اندازی کی مشق کرتے ہوئے بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ دو تین بھدی لیکن بے حد گوری چٹی عورتیں، یورپین نہیں شمالی ہند کی عورتیں چاٹ کھا کھا کر اور اپنے سینے کے پیچھے پیٹھ پر گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے بڑھا کر بجلی کی مشینوں پر کھڑی تھیں اور مشین کا پٹہ ان کے بڑھے ہوئے پیٹ پر خراد کا کام کر رہا تھا۔

ایک ساڑھے چھ فٹ کا غالباً ناروے کا رہنے والا نوجوان ایک کونے میں کراٹے کا داؤ سیکھ رہا تھا۔ داؤ سکھانے والا شکل و صورت سے انڈونیشیائی معلوم ہوتا ہے بلیک بیلٹ کا ماسٹر غرضیکہ پورا ہال جسمانی ورزش کرنے والی عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔

اس فزیکل کلچر اسکول کے لئے مسٹر ہارڈیکر نے جگہ بھی خوب دیکھ بھال کے چنی تھی۔ قریب ہی دو فائیو سٹار ہوٹل تھے۔ تاج اور اوبرائے شیراٹن اور کئی دوسرے چھوٹے چھوٹے ہوٹل، جن میں وہ ٹورسٹ سما جاتے تھے جنہیں تاج یا شیراٹن میں جگہ نہیں ملتی تھی۔

اس اعتبار سے یہ اسکول ایک مرکزی جگہ پہ واقع ہے۔ دلیپ نے سوچا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پہ ٹہوکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ہارڈیکر تھا۔

ہارڈیکر نے پوچھا۔ "یس مسٹر۔؟"

دلیپ نے کہا۔ "کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا۔؟" ہارڈیکر نے پوچھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔ کہاں سے شروع کروں۔؟" دلیپ بولا۔

"کیوں نہ پیرلل بار سے شروع کریں۔؟"

"چلو شروع کریں۔"

"پہلے سو روپے نکالو۔"

دلیپ نے اپنی سفید پتلون میں ہاتھ ڈال کر اسے سو کا پتہ دیا اور اس متوازی آہنی بار پہ اس نے ہارڈیکر........ کو جو دو چار عمدہ پینترے دکھائے تو ہارڈیکر..... کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

بولا۔ "میرے خیال میں فینسنگ سے شروع کریں۔"

دلیپ بولا۔ "چلو۔"

جو دو نوجوان فینسنگ رنگ میں تھے انہیں جلدی سے...... ہٹا کر خود ہارڈیکر fencing کی باریک نوکدار تلوار ہاتھ میں لے کر دلیپ کے مقابلے پہ کھڑا ہو گیا۔ دو چار داؤ کے بعد یکایک ہال میں ورزش کرنے والے مرد اور عورتوں کو معلوم ہو گیا کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ ان کے سامنے ہو رہا ہے۔

چند منٹ میں سب مرد اور عورتیں اپنی اپنی ورزشیں چھوڑ کر فینسنگ رنگ کے گرد جمع تھے۔

پندرہ منٹ میں دلیپ نے فینسنگ میں ہارڈ یکر کو ہرا دیا پھر ہارڈ یکر نے اسے تیر اندازی میں آزمایا۔ جوڈو، کراٹے میں کھلایا۔ پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے اپنے آفس کے کیبن میں لے گیا۔ اور بولا "کیا پیو گے۔؟"

"کچھ نہیں۔" دلیپ نے تولئے سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں یونہی ادھر آ نکلا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے۔ اُسے میں کہیں بھول تو نہیں گیا ہوں۔"

"میں تمہیں کام دے سکتا ہوں۔"

"تنخواہ کیا ہوگی۔؟"

"پندرہ سو روپئے مہینہ۔"

"اتنی تنخواہ تم مجھے دے سکتے ہو۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں ہو۔ گوری چمڑی والے کتنے سیاح میرے اسکول میں آتے ہیں۔ ڈالر، پونڈ، ین (جاپانی)، مارک کی جھڑی لگ جاتی ہے۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں مگر میں دو ہزار لوں گا۔"

"ڈن۔!" ہارڈ یکر نے ایسی پھرتی سے کہا۔ گویا اس نے بڑے سستے میں دلیپ کو خرید لیا ہو۔

دلیپ ہنسنے لگا۔

"کیا بات ہے۔؟" ہارڈ یکر نے اس سے ہنسی کا مطلب پوچھا۔

"بات یہ ہے۔" دلیپ نے اسے بتایا۔ "میں ایک بزنس میں ہوں۔ تاج میں ٹھہرا ہوں۔ تمہارا پتہ مجھے ایک ٹورسٹ نے دیا۔ میں نے خود یہ سارا فن بنکاک میں سیکھا تھا۔ ویسے تو میں ایک بیوپاری آدمی ہوں۔ ادھر محض یہ دیکھنے کے لئے آگیا کہ اگر مجھ پر برا وقت پڑا۔"

ہارڈ بیکر نے اس کا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر بولا۔ "اگر کبھی تم پر برا وقت پڑا تو سیدھے میرے پاس آجانا۔ سمجھے۔"

دلیپ کیبن کا دروازہ ہلتا چھوڑ کر نیم تاریک کوریڈور میں چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ دلیپ نے غور کر کے دیکھا۔ وہی سیماب بدن حسینہ تھی۔ جو عورتوں کے سیکشن میں پیرلل بار پر اپنے مومی بدن کی نمائش کر رہی تھی۔ مگر وہ ان عورتوں میں سے معلوم نہ ہوتی تھی۔ جو زیادہ ورزش کرتی ہیں۔ اور زیادہ ورزش کرنے کے بعد جن کے اوپر کے ہونٹ پر بالوں کی ایک ہلکی سی لکیر آجاتی ہے۔ ایسی کوئی لکیر اس خوب صورت عورت کے ہونٹ پر نہ تھی۔ چندر بدن اور چندر مکھی! اندر شانوں تک جھولتے ہوئے سنہرے بال اور جسم سے ایک ایسی خوشبو پھوٹتی ہوئی جو عطر لگانے سے نہیں، صرف صحت حاصل کرنے سے مل سکتی ہے۔

چند قدم اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی۔ پھر بولی۔

"یو آر سمپلی ونڈرفل ......" ونڈرفل سے دلیپ نے سمجھا کہ یہ عورت انگریز نہیں ہو سکتی ورنہ ونڈرفل کہتی۔

دلیپ نے اس کی طرف مسکرا کر کہا۔ "تھینک یو۔"

"تم نے یہ سب کچھ سیکھا تو کہاں سے۔؟" اس نے پھر پوچھا۔
دلیپ نے گھڑی دیکھی۔ کملا تھیجر دیکھنے گئی تھی۔ اس کے آنے میں ابھی خاصی دیر ہے۔ کہیں نہ کہیں تو وقت گزارنا پڑے گا۔
بولا۔" یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ سننا چاہو گی۔؟"
"آف کورس۔"
"چلو تاج میں چلیں گے۔"
"چلو۔!" وہ پُر امید لہجہ میں بولی۔
پھر چند قدم چلنے کے بعد کہنے لگی۔" میرا نام کیتھی ہے۔"
دلیپ بولا۔ "تم کیتھی ہو تو میں میتھی ہوں۔"
"میتھی تمہارا نام ہے۔؟ میتھیوز سے کیا۔؟ From Mathews تو میتھی ـــ تو ـ یہ جیسے کیتھراین سے کیتھی۔ ایس۔؟"
دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا۔" میں تو یونہی تک بندی کر رہا تھا وائمینگ یو تو You Know ـــ ورنہ میرا اصلی نام دلیپ سنگھ ہے۔"
"دلیپ سِنگ۔ ؟ ـــ سِنگ سِنگ تو امریکہ میں ایک جیل ہے۔"
دلیپ بولا۔" میں بھی ایک جیل کی طرح ہوں۔ جو عورت ایک دفعہ میری بانہوں میں آ جاتی ہے۔ مشکل سے باہر نکل پاتی ہے۔"
کیتھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ بولی۔" میرا خیال ہے میں تمہیں کچھ کچھ پسند کرنے والی ہوں۔"
دلیپ بولا۔" جب پکا فیصلہ کر لینا تو خبر کر دینا۔ میں پھولوں کا گلدستہ

لے کر آؤں گا۔"

کیتھی زور سے ہنسی۔ بولی ۔ "بدماش ۔!"

"ایں ۔؟" اب حیران ہونے کی دلیپ کی باری تھی۔ "یہ لفظ تم نے کہاں سے سیکھا ۔؟"

"ایک ٹیکسی والے سے ...... وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ تمہارے ٹیکسی والے اور ہمیشہ لمبے راستہ سے لے جاتے ہیں ۔"

دلیپ بولا ۔ "میں نے سُنا ہے کہ ساری دنیا کے ٹیکسی والے ایک سے ہوتے ہیں اور ایک بات تو عورتوں اور ٹیکسی والوں میں مشترک ہے ۔"

"وہ کیا ۔؟"

"ٹیکسی والوں کی طرح عورتیں بھی لمبے راستے سے لے جاتی ہیں۔" "اس !"

کیتھی زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ بولی ۔

"سور دا پتر ۔"

"یہ کیا ۔؟"

کیتھی بولی ۔ "اس ٹیکسی والے نے کہا تھا۔ جو مرد بدمعاش کہنے سے خوش نہ ہو اسے "سور دا پتر" کہنا چاہیئے ۔"

"تم اس کا مطلب سمجھتی ہو ۔؟"

"نہیں ۔"

دلیپ نے اسے اس کا مطلب سمجھایا، انگریزی میں تو وہ زور زور سے ہنسنے لگی ۔ اس نے اپنی گلابی بیل باٹم کے اندر کسی ہوئی ران پر زور سے ہاتھ مار کر کہا

"حرامی۔"

"یہ کیا۔؟" دلیپ کو کچھ کچھ غصہ آنے لگا۔

"وہ بولتا تھا ٹیکسی والا کہ جو مرد "سوور دا پتر" بھی کہنے سے خوش نہ ہوا سے "حرامی" کہنا چاہیئے۔"

اب دلیپ بالکل رام ہو گیا۔ اب اس لڑکی سے کچھ کہنا فضول ہے۔ ٹورسٹ بھی ہیں کچھ تو سیکھتے ہی نا۔ اس نے خود جب انگریزی سیکھنا شروع کی تھی۔ تو پہل گالیوں سے کی تھی۔ جانے گالیوں میں کیا مزا ہے۔ جو مہذب گفتگو میں نہیں۔ یہ لڑکی ہندوستان آکر یہی کر رہی ہے۔ پھر کس سے گلہ کیا جائے۔ یوں بھی کسی بدیسی لڑکی کے منہ سے دیسی گالیاں کتنی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اسے آج پہلی بار معلوم ہوا۔ اس نے کیتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے جھلاتے ہوئے بولا۔

"کہاں ٹھہری ہو۔؟"

"تاج میں۔"

"کون سے روم نمبر میں۔؟"

"1209"

وہ اسی منزل پر تھی اور اس کے کمرے سے اگلا دروازہ کیتھی کا تھا۔ دائیں طرف کمل۔ بائیں طرف کیتھی۔ بیچ میں قصور کی سیتی۔ دلیپ خود بخود ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنس رہے ہو۔؟"

"اس لئے کہ بغل والا کمرہ میرا ہے۔"

"تم۔؟" وہ حیرت سے بولی۔

"یس۔!"

"بدماش۔!"

"کنجری۔" دلیپ نے جواب دیا۔

"کن جری کیا۔؟" کیتھی کے چہرے پر ایک معصوم مبہم بھری حیرت تھی۔ اور لہجہ میں ایک سوالیہ نشان۔

"کنجری کنواری کو کہتے ہیں۔" دلیپ کے لہجہ میں شرارت تھی۔ شرارت اور شوخی دونوں۔!

"مگر میں تو کنواری نہیں ہوں۔" کیتھی زور دے کر بولی۔ "میں تین شوہر کر چکی ہوں۔ تینوں کو طلاق دے چکی ہوں اور اب چوتھے شوہر کی تلاش میں ہوں۔"

دلیپ بولا۔ "تو سمجھ لو آج سے تمہاری تلاش ختم ہو گئی۔!"

کیتھی پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ مگر اب تاج انٹرکانٹی نینٹل کا لاؤنج سامنے تھا۔

دلیپ نے گھڑی دیکھی۔ ابھی کمل کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس لئے وہ کیتھی کو سب سے اوپر کی بار میں لے گیا۔ جو راندے وُو لے سے ملحق تھی۔ اور جہاں سے باہر کی بندرگاہ کا نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ کیتھی اور وہ دونوں مغربی کنارے کی ایک میز پر جا بیٹھے۔ دلیپ نے اپنے لئے شیواس ریگل کا آرڈر دیا اور کیتھی نے ایک شیری لی۔

شیری کے گلاس کو گھماتے ہوئے اور اپنے بالوں کو جھلاتے ہوئے کیتھی بڑی ادا سے بولی۔ "شواس ریگل کا ایک پیگ تو چالیس روپے میں آتا ہے۔ اتنی مہنگی وسکی پینے کے لئے کافی دولت چاہیے۔ اتنی دولت کیا ورزش کے سکول میں ہے۔؟"

دلیپ بولا۔ "میں بنکاک میں اسکول نہیں چلاتا تھا۔ ورزش کے گر سکھاتا تھا۔ وہاں تو میں جیڈ کا بیوپاری تھا۔ اور تم جانتی ہو جیڈ بڑا نفع بخش سودا ہے۔"

دلیپ نے بڑی رسانیت سے کہا۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار کئے بیٹھا تھا۔ کوئی تو پوچھے۔ اچھا ہے اس وقت کیتی کے سامنے اس کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ ایک بار جو غلطیاں اس سے ہوں گی وہ انہیں مولچند شاہ کے سامنے نہیں دہرائے گا۔

"اور پھر کبھی کبھی ۔۔۔" دلیپ نے کیتی کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی کوئی اوسط کمائی والا آدمی بھی تمہاری ایسی حسین لڑکی کے سامنے دل اور دولت دونوں لٹا سکتا ہے۔"

چند لمحے سناٹا رہا۔ کیتی مسکراتی رہی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں کوئی سوچ بھی تھی اور سوچ کے اندر کوئی شبہ بھی۔ وہ کانچ کے باہر دیکھنے لگی۔ تاریک سمندر میں کھڑے جہازوں کی روشنیاں یکایک جگمگا اٹھیں۔ یہ رات کی آمد کا اعلان تھا۔ پھر کیتی نے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ بولی۔

"تم نے پوچھا نہیں، میں کیا کرتی ہوں۔؟"

"میں نے سوچا تم خود ہی بتا دو گی۔"

"اور اگر میں نہ بتاؤں تو۔؟"

"تو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ خوبصورت لڑکیوں سے کون ایسے سوالات پوچھتا ہے۔ خوبصورت لڑکیاں خوبصورت ہی رہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"میں یوگا سیکھنے ہندوستان آئی ہوں۔"

"تو تاج میں کیا کر رہی ہو۔؟ یہاں کوئی گرو ملا۔؟"

"میرا گرو دنیا رہا ہے۔ جب وہ بلائیں گے میں چلی جاؤں گی۔"

"یوگا سے تم کو کیا ملے گا۔؟"

"دل کا سکون۔ دل کی خوشی۔"

"تم بارس کب جا رہی ہو۔؟"

"جب گُرو دیو بلائیں گے۔"

"اگر دو ماہ تک نہ بلائیں۔؟"

"تو دو ماہ تک تاج میں رہوں گی۔"

"تو کافی پیسے ہوں گے تمہارے پاس۔؟"

"ہاں، میرے تینوں شوہر کافی امیر تھے۔"

"میں یوگا کیے بغیر ہی ہمیشہ خوش رہا ہوں۔ دل کا سکون مجھے حاصل رہا ہے۔"

"ایسے کیسے۔؟"

"اول تو میں نے تین شادیاں نہیں کیں۔ پھر میں زیادہ سوچتا نہیں۔ سکون آرام، دولت کے پیچھے بھاگتا نہیں۔ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میں اس لئے خوش ہوں کہ خوش رہتا ہوں۔ خوشی میں سمجھتا ہوں۔ خوشی کے پیچھے بھاگنے سے حاصل نہیں ہو سکتی محض خوش رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ خوشی ایک ــــ ایک ــــ کیا کہوں ایک Attitude of the mind ہے نا۔"

"ایٹی تیود۔؟" کیتھی نے پوچھا۔

"ایٹی تیود ــــ؟ (Attitude"

"ہاں۔"

"اچھا۔!" اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

"اپنے گُرو سے پوچھوں گی۔"

"اس خوشی کی تلاش میں تم کہاں سے آئی ہو۔؟"

"یوروپ سے۔"

"یوروپ میں کہاں سے۔؟"

"یہ ابھی نہیں بتاؤں گی۔"

"دوسری شیری کے بعد۔؟"

"دوسری کیا دس شیری کے بعد بھی نہیں۔"

"تمہارا پورا نام کیا ہے۔؟" دلیپ نے اس سے پوچھا۔

"کینتھرائین روزن برگ۔ مگر تم مجھے کیتھی ہی کہو۔"

"اور تم مجھے منتھی ...... مگر میری بیوی کے سامنے نہیں۔"

کیتھی چونکی۔ "تمہاری بیوی بھی ہے۔؟"

"ہاں ــــ کیوں۔؟"

"تم مجھے کچھ غیر شادی شدہ سے لگتے ہو۔"

"وہ کیسے۔؟"

"بس سونگھ لیتی ہوں۔"

"مجھے اچھی طرح سونگھ کے کچھ اور بھی بتاؤ۔" دلیپ نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اس کا بھی وقت آئے گا۔" کیتھی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور دو بے حد سرخ دھبے اس کے رخساروں پہ چمکنے لگے۔

دلیپ نے دوسرے شاٹ اس رنگیل کا آرڈر دیا۔

کیتھی بولی۔ "تم خوشی کی بات اس لئے کر رہے ہو کہ تم تاج میں بیٹھے ہو اور شواس ریگل پی رہے ہو۔"

"نہیں۔" دلیپ بولا۔ "میں اس وقت بھی بہت خوش تھا۔ جب میں ایک گندے بازار میں پتھروں کے فرش پر سوتا تھا۔"

"سچ۔ کیا ایسے دن بھی تم پر آئے ہیں۔؟"

دلیپ نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

کیتھی نے اپنے گلاس کی طرف دیکھا شیری کے صرف دو گھونٹ باقی رہ گئے تھے۔

دلیپ نے پوچھا۔ "ایک اور شیری۔؟"

اس کا جواب کیتھی نے یوں دیا۔ "تمہاری بیوی اس وقت کہاں ہے۔؟ تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے۔؟"

"تم سے ملنا جو تھا۔"

"یہ کوئی جواب نہیں ہے۔"

دلیپ چپ رہا۔

پھر کیتھی بولی۔ "تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہے۔؟"

"کبھی محبت، کبھی نفرت، کبھی انتہائی کھجلی۔"

"کھجلی کیا۔؟"

"جی چاہتا ہے بیوی کو سر سے پاؤں تک کھجایا جائے شاید کوئی کام کی بات نکلے۔"

کیتھی اکرم سنہس پڑی "کیسی ہے تمہاری بیوی۔ خوب صورت۔؟"

"ہر خوب صورت عورت کی خوب صورتی اپنی طرح کی ہوتی ہے مجھے عورتوں کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ مگر اتنا جانتا ہوں کسی ایک عورت کی خوب صورتی دوسری عورت سے میل نہیں کھاتی۔ شاید اس لئے ہم مرد ایک سے زیادہ عورتوں سے محبت کر سکتے ہیں۔"

"اور مجھے کچھ عرصے کے بعد اپنے تینوں شوہر ایک سے لگے تھے۔ اتنے ہی احمق، ظالم اور بور..... "کیتھی کے لہجہ میں کراہیت تھی۔

"تو پھر تم چوتھی شادی کیوں کرنا چاہتی ہو۔؟"

"مذاق کر رہی تھی۔ اب کبھی شادی نہ کروں گی ــــــ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔"

اب بار میں کسی میز پر جگہ نہیں تھی۔ دروازے کے اندر اور اس کے باہر بہت سے لوگ اس موقع کی تلاش میں کھڑے تھے کہ کوئی میز خالی ہو تو جا بیٹھیں۔ دو اسکنڈے نیوین لڑکیاں جنگی پوری پیٹھ کھلی تھی۔ اپنے اپنے بوائے فرینڈ سے پیٹھ سہلا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے یکا یک دلیپ کو ایسا لگا جیسے اس نے کمل کو دیکھ لیا دلیپ نے فوراً منہ کانچ کی دیوار کی طرف کر لیا۔ دو لمحوں کے بعد جب اس نے رخ پھیرا تو اسے محسوس ہوا جیسے کمل اسے دیکھے بغیر مایوسی سے لوٹ گئی ہے یا شاید ممکن ہے اس نے دیکھ لیا ہو۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ معلوم ہو جائے گا۔ اس نے کیتھی سے کہا۔

"دوسری شیری!"

"نہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولی۔ اور اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔

"تو کل کا لنچ تم میرے ساتھ لے رہی ہو۔؟" دلیپ نے کہا۔

اس کی نیلی پتلیاں پھیل گئیں وہ حیرت سے بولی۔ "مگر میں نے تو ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔"

"اب کر لو۔"

"نہیں۔ میں مصروف ہوں۔" کیتھی نے کہا۔ حالانکہ دلیپ جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"تو شام کا ڈنر۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

"اپنی بیوی کا کیا کرو گے۔؟"

"وہ میں جانوں۔ تمہیں کیا۔"

"لگتا ہے۔ تم اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتے ہو۔؟"

"نہیں۔" دلیپ ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری شادی اب ٹوٹنے کے قریب ہے۔ وہ الگ کمرے میں رہتی ہے۔ میں الگ کمرے میں۔"

"وہ کون سے کمرے میں ہے۔؟"

"1211 میں۔"

"اور تم۔؟"

"کہا نا 1210 میں۔"

"اور میں 1209 میں ـــــ کیا عجیب اتفاق ہے۔" کیتھی کا موڈ یکایک ٹھیک ہونے لگا۔ وہ اپنا پرس۔ لائیٹر۔ سگریٹ کیس میز سمیٹتے ہوئے بولی۔

"میں دو دن بہت مصروف ہوں۔ تم سے پھر بات کر لوں گی یا دو دن کے بعد مل لیں گے۔"

"تم وہ کھیل، کھیل رہی ہو جس کا نام ہے۔" ملنا مشکل ہے"

"ملنا مشکل نہیں ہے۔ مل کر بچھڑنا مشکل ہے۔" کستیمی نے جذبات سے خالی آواز میں مگر کسی قدر تلخی سے کہا۔ وہ اٹھ گئی۔ اور جب دلیپ بھی اس کے ساتھ اٹھنے لگا تو بولی۔ "نہیں بیٹھے رہو۔ پہلے مجھے جانے دو۔ میرے جانے کے دس منٹ بعد تم جا سکتے ہو۔"

"کیوں۔؟"

مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ کیا لچکتی ہوئی فگر تھی اس کی جیسے ہر عضو بید کا بنا ہوا ہو۔

دلیپ نے شواس ریگل کا ایک چھوٹا پیگ اور منگا لیا۔

دلیپ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو کمل سامنے تھی۔ پیچھے مولچند شاد دکھائی دے رہا تھا۔ دلیپ نے مسکرا کر دروازہ اچھی طرح کھول دیا۔

"تم دونوں کہاں مل گئے۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

کمل اپنا پرس جھلاتی ہوئی بولی۔ "راکسی میں۔ میں انٹرول میں باہر سنیکس کونٹر پر کوک پینے کے لئے گئی تو کیا دیکھتی ہوں۔ راجی وہیں پر موجود ہے ہمبرگر کھا رہا ہے انٹرول کے بعد ہم نے اکٹھے سینما دیکھا کیونکہ بالکونی میں زیادہ رش نہیں تھا۔"

"کون سی پکچر تھی۔؟"

"ٹٹ فار ٹیٹ (Tit for Tat)"

"واٹ از دیٹ۔؟" دلیپ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پکچر کا نام ہے۔" مولچند بولا۔ "آجکل پرانے ڈھنگ کے نام نہیں آتے ہیں۔ گان وِد دی وِنڈ۔ (Gone with the wind)
یا رومینس اِن آری زونا۔ (Romance in Arizona)
آجکل تو بس ایسے ہی نام آتے ہیں ٹٹ فار ٹیٹ یا ہیلم آن دی میٹ۔
(Helm on the mat)

"پھر ہم لوگ پارسیا چلے گئے۔ نیا ریستوران کھلا ہے۔ بہت عمدہ چائے ملتی ہے۔ چائے پی۔ گپ لڑائی۔ اب یہاں آ گئے۔ اپنے پیارے ہستی ڈوشوہر کے پاس۔" رانی سے کھسکتے ہوئے کمل، دلیپ سے سپیکر بولی۔

مولچند مسکرا کر سگار پیتا رہا۔

"بیٹھ جاؤ بھئی۔ مولچند۔" دلیپ نے کہا۔ "کیا پیو گے۔؟"

"مجھے رانی کہو۔ جیسے تمہاری بیوی کہنے لگی ہے تو کچھ پیوں گا۔"

"آل رائیٹ رانی۔ بولو کیا پیو گے۔؟"

"تم لوگوں کو تو کہیں ڈنر پہ جانا ہے ناں۔؟" مولچند نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ مگر ایک جلدی جلدی میں ہو جائے۔" دلیپ بولا۔

"ہو جائے۔!" رانی صوفے میں دھنس گیا۔

دلیپ نے اس کے لئے اسکاچ کا ایک پیگ بنایا۔ ایک اپنے لئے۔ دونوں نے ایک ایک گھونٹ لیا۔ اتنے میں کمل گلدان کے پھولوں کو ٹھیک کرتی رہی۔ پھر بولی۔

"بہت دنوں سے ناوِل بانا سیکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ وقت ہی نہیں ملتا۔"

"ورکنگ گرل جو ٹھہریں۔" رابی طنزیہ انداز میں بولا۔ "بچاری کو روز دفتر جانا پڑتا ہے۔ شوہر نکھٹو جو ہوا۔۔۔۔۔"

تینوں ہنسنے لگے۔ دلیپ کو معلوم نہیں تھا کہ "اکی بانا" کسے کہتے ہیں۔ ابھی اس کی تعلیم اور اس کا علم اتنا گہرا نہ تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ خاموش رہنا پسند کرتا تھا۔

رابی بولا۔ "اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے اکی بانا کی ٹریننگ کا انتظام کرسکتا ہوں۔ ایک جاپانی عورت ہے۔ عورت کیا ہے۔ لڑکی ہے۔ لڑکی کیا ہے۔ گڑیا ہے۔ گر پھولوں کے سلسلہ میں جو اس کا علم ہے وہ بمبئی میں مشکل ہی سے کسی دوسرے کے پاس ہوگا۔ خصوصاً اکی بانا سجاوٹ کے سلسلہ میں اسے اس شہر میں حرفِ آخر سمجھنا چاہیئے۔"

دلیپ نے اطمینان کی سانس لی۔ کم سے کم اسے اتنا تو معلوم ہوگیا۔ کہ اکی بانا کا سسٹم جو کچھ بھی وہ تھا، پھولوں کی سجاوٹ سے تعلق رکھتا تھا۔

کمل نے دلیپ کی طرف نگاہ ڈالی۔ گویا پوچھ رہی ہو کیا کہتے ہو۔ پھر خود ہی بولی۔ "ابھی سیکھ کر کیا کروں گی۔ جانے اس شہر میں رہنا بھی ہے کہ نہیں معلوم نہیں میرے شوہر کا کیا ارادہ ہے۔۔"

"کہیں اور گئے بھی تو کیا۔ مہینے بھر تو میں ہیں۔ ممکن ہے یہیں رک جائیں۔ آج میں نے ہارڈ لیکا فزیکل کلچر اسکول بھی دیکھ لیا ہے۔" دلیپ نے جواب دیا۔

"ایک مہینہ بہت ہے۔" رابی نے معنی خیز نگاہوں سے کمل کو تاکتے

ہوئے کہا۔ "وہ جاپانی لڑکی تو بیس دن میں تمہیں پھولوں کی نمائش میں ماہر بنا دیگی
مگر سیکھنے کے لئے اس کے یہاں جانا پڑیگا۔ والکیشور روڈ پر رہتی ہے۔"

دلیپ نے سر ہلا دیا۔ کمل نے بھی۔

راہی نے ٹیلی فون گھمایا۔ بات کی۔ واپس ٹیلی فون رکھ کر بولا۔

"ڈن۔ وہ روز صبح ساڑھے دس سے بارہ بجے تک تمہیں اکی بانا پھولوں
کی سجاوٹ کی تعلیم دے گی۔ اوکے۔؟"

"اوکے۔!" کمل نے خوشی سے ہاتھ ہلایا۔

راہی نے جلدی سے گلاس خالی کیا۔ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ پرسوں کا پروگرام پکا ہے نا۔؟"

"بالکل۔" کمل نے اسے اپنے موتیوں کے سے دانت دکھائے۔

"بائی بائی۔" کہہ کر وہ چلا گیا تو دلیپ نے کسی قدر بیزار ہو کر پوچھا۔

"یہ پھولوں کی سجاوٹ کا کیا بیکار سلسلہ ہے۔"

"تم تو گدھے ہو۔ نرے گدھے۔" کمل کے لہجہ میں بھی تلخی تھی۔

دلیپ کا ایک ہاتھ گلاس کو پکڑے ہوئے تھا۔ دوسرا ہاتھ گول ٹیبل پر
تھا۔ اس خالی ہاتھ میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ وہ اس وقت کمل کو زور سے
چانٹا مارنا چاہتا تھا مگر کوشش کر کے اس نے اپنے ہاتھ کو روک لیا۔ وہ
وہیں گول ٹیبل پر رہا بس اس میں ذرا سی جنبش پیدا ہوئی پھر وہ بھی ختم ہوگئی۔
پھر اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر گویا سارے غصہ کو نیچے اتار دیا اور چہرے
پر مسکراہٹ لاکر بولا۔

"کیونکہ میں گدھا ہوں۔ یہ تو سمجھا دو۔"

کمل بولی۔ "یہ ایک طریقہ ہے اُسے بلانے کا، اس سے اکیلے ملنے کا۔ تم دیکھ لینا۔ میرے اکی بانا سیکھنے کے ٹائم میں وہ اکثر وہاں چلا آیا کریگا۔ مجھے یا تمہیں اسے ٹیلی فون نہیں کرنا پڑیگا۔"

دلیپ نے بات کا رخ پلٹ کر کہا۔ "اچھا تم یہ بتاؤ۔ تمہیں وہ، اچانک راکسی میں کیسے مل گیا۔ محض اتفاق۔؟"

"اس قسم کے واقعات محض اتفاق سے نہیں ہوتے، باقاعدہ پلان کئے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں یا تو وہ خود لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ یا اس کا کوئی آدمی وہاں تھا۔ جس نے میرا راکسی تک پیچھا کیا۔ وہ بیحد سمجھدار باقاعدہ پلان کر کے چلنے والا بلیے بوائے ہے۔"

وہ سمجھتا ہوگا۔ اس نے تمہیں ہک میں ڈال لیا ہے۔"

"نہیں۔ ابھی تو اس نے چارہ بھی نہیں ڈالا۔ آج تک والی ڈوری مجھ غریب مچھلی کے لئے پانی میں پھینکی ہے۔"

کمل اور دلیپ دونوں ہنسنے لگے۔

پھر کمل نے پوچھا۔

"تم کہاں کہاں رہے۔؟"

دلیپ نے اسے سب کچھ بتا دیا مگر کیتکی سے ملاقات والی بات نہیں بتائی۔ [illegible] کی مجھ سے پیار نہیں کرتی تو میری تو مہ داری کیا ہے۔ اس کا جنسی جیون مجھ سے الگ ہے۔ میرا جنسی جیون اس سے الگ۔ ہمارے بزنس کا راستہ

ایک ہے۔ باقی سب کچھ الگ ہے۔ پھر میں اسے کوئی دوسری بات کیوں بتاؤں۔؟"

"مجھے کچھ روپیوں کی ضرورت ہو گی۔"

"کیوں۔؟"

"یہاں میں نے ٹران مور نیو لیڈیز ٹیلر کی دوکان دیکھی ہے۔ بہن تاج بیدی کچھ غضب کے ڈیزائین ہیں اس کے پاس۔ میرے پاس کچھ نئے ڈریس ہونے چاہئیں۔ کم سے کم چھ سات تو نئے ڈریس ہونے چاہئیں۔ پھر میں ادل بدل کرتی رہوں گی۔"

دلیپ نے جیب سے دس ہزار روپئے نکال کے اُسے دیئے۔ اور بولا۔" یہ تمہارے حساب میں سے کاٹ لئے جائیں گے۔"

"او۔ کے پارٹنر۔"

یکایک باہر کی گھنٹی بجی۔

کمل بھاگی بھاگی دروازے تک گئی۔

دروازہ کھولا تو ایک عورت چند قدم لڑکھڑاتی ہوئی اندر آئی اور پھر فرش پر گر کر بیہوش ہو گئی۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

یہ کیتکی تھی۔

کمل نے کیتھی کو فرسٹ ایڈ بہم پہونچائی۔ اسے ہوش میں لایا گیا تو اس نے بتایا کہ جو ہنی اس نے چابی لگا کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک آدمی اس لئے اندر پا یا مگر بیشتر اس کے کہ وہ اس کو پکڑ سکتی۔ اس آدمی نے چاقو دکھایا بلکہ بازو پر زخم لگا کے بھاگ گیا۔ ناٹا سا کالے رنگ کا ہندوستانی تھا۔ نہیں، نہیں۔ ہوٹل کا بیرو نہیں تھا۔ کم سے کم اس فلور کا بیرہ نہیں تھا۔ نہ اس نے ہوٹل کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

خوش قسمتی سے زخم معمولی تھا۔ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائیگا۔ کمل نے اسے بتایا۔ کیتھی کو ایک پیگ برانڈی کا دلیپ نے پیش کیا جو اس نے شکریئے کے ساتھ غٹ غٹ کر کے اتار لیا۔ اسی اثنار میں کمل برابر اس کی نرسنگ کرتی رہی تھی۔ برانڈی اسے کو کیتھی بہت جلد اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک

محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ دلیپ، اور کمل سے، اس طرح جیسے وہ ان دونوں کے لئے اب تک بالکل اجنبی ہو۔ پھر کمل اور دلیپ دونوں نے اپنا تعارف کرایا۔ پھر دلیپ نے پوچھا۔

"کمرے سے کوئی چیز گم تو نہیں ہوئی۔؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھ پر حملہ ہوتے ہی میں چیخ مار کر باہر بھاگی اور پہلا کمرہ جو ملا اس میں آ گئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا تم چل سکتی ہو۔؟"

"ہاں ــــ اب تو ٹھیک محسوس کر رہی ہوں۔"

"تو چلو۔ تمہارے کمرے میں چل کے دیکھتے ہیں۔" کمل بولی۔

کمل اور دلیپ دونوں کلیتھی کے کمرے میں گئے۔

سارا کمرہ تلپٹ تھا۔ جو کوئی بھی چور تھا یا جو کوئی بھی وہ تھا، اس نے بڑے ماہرانہ طریقے سے کمرے کی تلاشی لی تھی۔ ایک ایک کونا چھان مارا تھا۔ فرش کا کارپٹ تک الٹ دیا تھا۔ صرف کمرے ہی کی نہیں، باتھ روم تک کی تلاشی لی تھی۔

جس عرصہ میں کمل اور دلیپ کمرے کے مختلف کونے دیکھتے رہے۔ کلیتھی یہ دیکھتی رہی کہ اس کے کمرے سے کون کون سی چیزیں غائب ہیں۔ اپنے وارڈ روب۔ سوٹ کیس اور دیگر سامان کو دیکھ کر اس نے بڑی حیرت سے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے چور یہاں سے کچھ بھی نہیں لے گیا۔ میری گھڑی اور ہیرے کی انگوٹھی۔ نقدی۔ سب موجود ہیں۔"

"پھر سر چودھری کیا چودھری کرنے آیا تھا۔ ؟"

جواب میں کیتھی نے اپنے کندھے اچکائے۔ جیسے وہ اس سوال کا جواب دینے سے معذور ہو۔

"جو کوئی بھی وہ تھا وہ لینے کیا آیا تھا۔ ؟" دلیپ نے یہ سوال تقریباً اپنے آپ سے کیا۔

کمل بولی۔ "ایک بات ہو سکتی ہے۔" کمل نے کیتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم سے پہلے جو آدمی یہاں آکر رہا ہوگا ممکن ہے وہ یہاں کچھ چھوڑ گیا ہوگا۔ یا چور کو ایسا شبہ ہوا ہو کہ وہ کوئی چیز اس کمرے میں چھوڑ گیا ہے جو اس کے لئے قیمتی ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی عام چیز نہیں تھا۔"

"یہ بات تو صاف ہے۔" کیتھی نے اقبال کیا۔ "معاملہ کچھ پُراسرار ہے۔"

"پولیس میں رپورٹ کروگی۔ ؟" دلیپ نے پوچھا۔

"یہ ہوٹل والے جانیں۔" کیتھی بولی۔ "بظاہر میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی ہے۔ ہوٹل والے اگر مناسب سمجھیں گے تو رپورٹ کریں گے۔"

"اگر ہوٹل کا سب سامان ٹھیک حالت میں موجود ہے اور تمہارا سامان بھی غائب نہیں ہوا ہے۔ تو رپورٹ کرنے سے فائدہ۔ ؟" کمل پوچھا۔ ہم تینوں مل کر تمہارا سامان ابھی ٹھیک کئے دیتے ہیں۔"

آدھے گھنٹے میں سب سامان قرینے سے سجا دیا گیا مگر کیتھی کچھ خائف سی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگی۔ "سوچتی ہوں کمرہ بدل لوں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ ؟" کمل کو اب کیتھی سے ہمدردی پیدا

ہوگئی تھی۔" ہم دونوں تمہارے اس قدر قریب ہیں۔ اگر ذرا سی بھی فون اٹھا کر بول دو گی تو فوراً کوئی نہ کوئی تمہارے پاس آجائیگا۔"

"او ــــ تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ۔!" کیتھی نے شکریہ ادا کیا۔

اس کا شکریہ لے کر اور کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے کمل اور دلیپ وہاں سے چلے آئے......

دلیپ نے کمل کے کمرے میں بیٹھ کر ایک سگریٹ سلگایا اور چھت کی طرف گردن اٹھا کر دھواں پھینکنے لگا۔

"معاملہ پُراسرار ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"چور کیوں آیا تھا۔؟"

"کیا لینے آیا تھا۔؟"

"کیا لے گیا۔؟"

"یا ناکام گیا۔؟"

"یا کہ چور آیا ہی نہیں تھا۔؟"

"پھر معاملہ کیا ہے۔ کیا ہے۔؟" دلیپ نے خاموشی سے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کمل بولی۔" یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔"

"کیا اس کے بازو کا زخم بھی جھوٹا ہے۔؟" دلیپ نے سوال کیا۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ چور نہیں آیا تھا۔ ضرور آیا تھا۔ ممکن ہے۔

کچھ لے ہی گیا ہو۔ جب ہی تو اس نے کیتھی پر حملہ کیا! ممکن ہے کیتھی نے چور سے کچھ چھیننے کی کوشش کی ہو اور اس نے چاقو سے وار کیا ہو۔" کمل دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

"چور کیا لے گیا۔؟" دلیپ نے کمل سے پوچھا۔

"کوئی ایسی چیز جو کیتھی نہیں بتا سکتی۔ نہ مجھے نہ تمہیں۔ نہ پولیس کو۔!"

"کیا۔؟"

"جیسے ماری جوانا یا حشیش ایک پیکٹ۔ چرس — ایسی ہی کوئی اور نشہ آور چیز جو آجکل یوروپ اور امریکہ میں ہیروں کے بھاؤ بکتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔؟" دلیپ نے کچھ کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔!" کمل نے اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ دلیپ کو آگے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

"تم نے دیکھا نہیں۔" کمل بولی۔ "جب میں نے اس سے کہا کہ ہوٹل یا پولیس میں رپورٹ کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے تو کیتھی جلدی مان گئی۔"

"ہوں۔" دلیپ نے دھوئیں کا ایک چھلا کمل کی طرف چھوڑا، "تمہاری بات میں وزن ہے"

"میری ہر بات میں وزن ہوتا ہے۔" کمل نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ دلیپ کسی قدر سٹپٹا گیا۔ تلخی سے بولا۔ "مارو گولی کیتھی کو۔ ہمیں اس کے پرابلم سے کیا واسطہ۔ ہمیں اپنے پرابلم سے غرض ہے۔"

"اس کی تم مت فکر کرو۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔"

"کیا سوچا ہے ۔؟"

"عورتیں سوچتی کم ہیں ۔ اپنی چھٹی حس سے زیادہ کام لیتی ہیں ۔ مرد کا تو صرف دماغ سوچتا ہے ۔ عورت اپنے سارے جسم سے سوچتی ہے ۔ راندے وو کے ڈنر کا وقت آنے دو ، پھر دیکھنا .....۔"

راند لے دو کے ڈنر والے دن کمل نے خاص طور پر بال بنوائے۔ دن میں دو بار غسل لیا۔ شام میں بسنتی رنگ کا بلاؤز پہنا اور اس کے نیچے بسنتی اور سبز لہریوں والی گھیر دار اسکرٹ جو سامنے سے جھولے کا تاثر پیدا کرتی تھی اور پیچھے سے گھماؤ کا۔ کانوں میں امی ٹیشن جیولری کے آویزے پہنے اور گلے میں گلابی منکوں کی مالا۔ کمل، دلیپ کو سمجھانے لگی۔

"آجکل اصلی زیور پہننے کا فیشن ختم ہوچکا ہے۔ اصلی زیور لاکر میں رکھا جاتا ہے۔ یا گھر میں پہنا جاتا ہے۔ مگر بڑی بڑی پارٹیوں میں اور باہر کے فنکشن میں سب ہی خواتین امی ٹیشن جیولری پہنتی ہیں۔ خوب صورت بھی ہوتا ہے اور چوری کا بھی کھٹکا نہیں ہوتا۔"

اسی دن دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے "رابی" کے ساتھ کھایا تھا۔

اور برائے شیراٹن میں اطالوی کھانا۔ مولچند سب کے لئے سپاگھٹی سیلائز آرڈر کر رہا تھا۔ مگر کمل نے دلیپ کے لئے اس ڈش کو منع کر دیا کیونکہ کمل کو معلوم تھا کہ دلیپ کے لئے سپاگھٹی کو سنبھال کر کھا لینا مشکل ہو جائیگا۔ سپاگھٹی کو کانٹے کے گرد لپیٹ کر کھانا بھی ایک آرٹ ہے اور خاص تجربہ چاہتا ہے۔ اس لئے کمل نے اپنے لئے تو سپاگھٹی سیلائز کا آرڈر منظور کر لیا۔ مگر دلیپ کے لئے مش روم اور میکرونی۔ سب سے پہلے لیکیو ہیٹر میں سنسناتی جھاگ اڑاتی آملیٹ سوفلے آئی۔ اس کے بعد مولچند اور کمل کیلئے سپاگھٹی سیلائز اور دلیپ کیلئے مش روم میکرونی جس کے ساتھ مشہور اطالوی وائن کیانتی کا جوڑ بہت عمدہ رہا۔ دلیپ کو غصہ تو بہت آیا۔ پہلی ڈش تو آملیٹ کی تھی جس میں لیکیو ہیٹر ڈال کر اسے خواہ مخواہ بدمزہ کر دیا تھا۔ پھر یہ مش روم ہے کیا۔ ؟ کُکُر متّا ہے اپنے میاں کا۔ اور میکرونی۔ ؟ میدے کی نلیاں ہیں۔ جی ہاں۔ اب چاہے اسے میکرونی کہہ لو یا کچھ اور مگر کمل اور مولچند تھے کہ اس اطالوی کھانے پر نثار ہوئے جا رہے تھے۔ اسے مولچند عرف رابی سے کچھ عجیب سا حسد محسوس ہونے لگا حالانکہ کمل جو کچھ کر رہی تھی اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مولچند ان دونوں کو گھمانے کے لئے لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دلیپ نے سر درد کے بہانے اجازت چاہی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد رابی، کمل کو بھی واپس ہوٹل چھوڑ گیا۔ اور شام کو پھر ڈنر کے لئے آنے کا وعدہ کر گیا۔

آج ڈنر پر فرانسیسی کھانا تھا۔ اور مینو میں ان کھانوں کے کھتے

لمبے لمبے نام تھے۔ Omble cheuelior Peche beurre
اور یوں پوچھئے تو یہ محض ایک خاص مچھلی کی ڈش تھی، جو سامن فیملی blence
سے تعلق رکھتی تھی۔ تلے ہوئے بینگنوں کے لئے کوئی دو فٹ لمبا نام تھا۔ اور جو
چار فٹ لمبا نام تھا اس کا پتہ چلانے سے معلوم ہوا کہ وہ پنیر میں بیک کیا ہوا چکن
ہے۔ بہر حال کھانا برا نہیں تھا۔ فرانسیسی کھانوں کا اپنا ایک مزا ہوتا ہے۔
دلیپ کو احساس ہوا۔

Torrine de conordaux Treffe

کے بعد Pomlet aux Morrilles کے ساتھ
شاتو دایا کی وائین مزا دے گئی۔ مگر صاحب جو گھر کے کھانے میں مزا ہے، اپنے گھر کے
کھانوں میں۔ دلیپ کو اس بڑھیا کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا یاد آیا جو اس نے جیوتشی
جی کے یہاں سے نکلنے کے بعد کھایا تھا۔ اس سادہ کھانے میں کیا لطف تھا۔
بیچ بیچ میں دو مرتبہ کمل اور رابی ڈانس کرنے کے لئے اوپنچے فلور
پر چلے گئے اور دلیپ کو محسوس ہوا کہ کمل ناچتی بھی بہت اچھے ڈھنگ سے ہے۔
سچ پوچھو تو کمل اور رابی کی جوڑی کس قدر عمدہ دکھائی دیتی ہے۔ دلیپ کو
اپنے دل میں پھر ایک چاقو سا چلتا محسوس ہوا۔ حالانکہ میں نے خود ہی تو اسے
رائے دی تھی۔ دلیپ نے سوچا کہ اس بلے بلوائے کو رام کرنے کے لئے جو کچھ بھی
ترکیب لڑائی ہوگی، کمل ہی کو لڑانی ہوگی۔ تو پھر اب حسد کیسا؟ وہ تو ایک کھیل
کھیل رہی ہے۔ نہیں غصہ کس بات پر آ رہا ہے۔؟ بیشک کھیل ہی تو ہے مگر کبھی کبھی
کمل کی آنکھوں میں یہ کیسی چمک آ جاتی ہے۔ جب وہ مسکرا کر رابی کی طرف دیکھتی ہے۔

تو وہ جذبہ کتنا اصلی معلوم ہوتا ہے۔

"She is a betch" دلیپ نے دل ہی دل میں کہا۔

اور پھر خود ہی کوئی اس کے دل میں بول اٹھا۔ "اور تم تو بالکل فرشتے ہونا۔ دھوئے دھلائے پاک صاف، پر لگائے ہوئے، ابھی ابھی بادلوں سے اترے ہو۔ بیچاری لڑکی۔ ٹھیک ڈھنگ سے تمہارے مشورے کے مطابق کام کر رہی ہے۔ اور تم ہو کہ رشک وحسد سے جھلسے جا رہے ہو۔ آخر کیوں۔؟"

دلیپ کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

❖ ❖ ❖

رات کو گھنٹے بھر کے لئے ان دونوں کی بیٹھک ہوئی یعنی مجلس مشاورت۔ جہاں اب تک جو ہوا اس پر غور کیا گیا۔ اور اس کے آگے کا پروگرام سوچا گیا۔

دلیپ نے پوچھا۔ "جب میں سیر کے بیچ چلا آیا تو اس نے تمہیں ہاتھ لگایا۔؟"

"ہاں۔" کمل بولی۔ "ایک بار اس کا ہاتھ میرے کندھے تک گیا تھا مگر میرا ایکشن دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے ہٹا لیا۔"

"تمہارا ایکشن کیا تھا۔؟"

"میرا کندھا پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا۔"

دلیپ نے کمل کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔ ایسے معاملوں میں عورتوں

کو بات کتنی کم کرنی پڑتی ہے۔ آنکھوں کی اک نگاہ سے، لبوں کی اک جنبش سے کندھے کی اک حرکت سے وہ بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔ دلیپ نے سوچا۔ ابھی اسے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔

"پھر۔ ؟" دلیپ آگے چلا۔

"پھر کیا۔ ؟" کمل نے پوچھا۔

"اس نے تمہارا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ؟"

"نہیں۔"

"چومنے کی ......" دلیپ چپ ہو گیا۔

"نہیں۔" کمل غصہ سے بولی۔ "اس کا موقع بھی آئے گا۔ اور مجھے وہ موقع دینا پڑیگا۔ مگر ابھی نہیں۔ اس سونے کے پتھرے کی تلاش میں ایک حد تک میں ضرور جا سکتی ہوں مگر بس ایک حد تک۔ اس کے آگے نہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے اس کے آگے جانے کا موقع ہی نہیں آئیگا۔ مگر تم کیوں ایک حاسد شوہر کی طرح بات کر رہے ہو۔ ؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ جیسے تم میرے فرضی شوہر ہو۔ میں راجی کی فرضی محبوبہ ہوں۔"

دلیپ صوفے سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔ باہر جاتے ہوئے اس نے دروازہ زور سے بند کیا۔

دن گزرتے گئے۔ رابی اکثر اکی بانا کے سبق کے اوقات میں کمل سے جا ملتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اسے کسی کیفے میں لے جاتا۔ لنچ اکثر اکٹھے کرتے۔ دونوں یا تینوں۔ بالعموم دلیپ ان کی صحبت سے غائب رہتا۔ وہ اور کیتھی فزیکل کلچر سکول میں اکٹھے ورزش کرتے۔ تاج کے سوئمنگ پول میں نہاتے۔ پھر بڑے بڑے تولیوں سے بدن صاف کرتے ہوئے دِکر کرسیوں پر لیٹے لیٹے گملٹ یا شیری ، جیرے دھیرے سڈپ کرتے۔ دلیپ نے بھی سب حجاب اٹھا دیئے تھے۔ جیوں جیوں کمل ، رابی کے قریب جا رہی تھی۔ وہ کیتھی سے ملتفت ہو رہا تھا۔ کیتھی اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھی۔ اب تک اس نے سفید نسل کی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی تھی۔ کیتھی اس کی زندگی میں پہلی ایسی عورت تھی۔ اس تجربے کا اپنا ایک رس تھا۔ مزاج تھا۔ کیف و کم تھا۔ ایشیائی عورت محبت کے گہرے تجربے میں بھی کچھ چھپائے جاتی ہے۔ مغربی عورت نہ کچھ

باقی رکھتی ہے نہ باقی رہنے دیتی ہے۔ عین سرخوشی کے عالم میں بھی ایشیائی عورت گہری سانس کے ساتھ آہ کرتی ہے۔ مغربی عورت اس عالم میں واہ کرتی ہے۔ ایک کے دل میں درد ہے، دوسری کے لہجہ میں سرمستی و بیزاری۔ کمل نے کوشش کی تھی کہ کیتھی بھی مولچند شاہ کے محل نما گھر میں ان کے ساتھ پارٹیوں میں شرکت کرے۔ مگر کیتھی عین موقع پر کسی نہ کسی طرح ٹال جاتی تھی۔ ہاں دلیپ کے ساتھ گھومنا پھرنا اسے بہت پسند تھا۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں ۱۹۷۵ء کے ××× تھے۔ خارج کی دنیا ہی ان کے لیے سب کچھ تھی۔ اور بدن کے تقاضے سب پر حاوی تھے۔ بدن کی خوبصورتی، چستی اور صحت، بدن کی مانگ اور اس مانگ کو پورا کرنے کی مسرت ہی سب کچھ تھی۔ رات کو چپکے سے کیتھی، دلیپ کے کمرے میں آجاتی۔ اس وقت وہ اس کی باہوں میں سو رہی تھی، جیسے ماہتاب بادل کی آغوش میں پناہ لے۔ کسی معصوم بچے کی طرح دھیرے دھیرے اس کی سانس چل رہی تھی۔ اس معصوم بچے کی طرح جس نے پیٹ بھر کے دودھ پی لیا ہو۔ کیتھی کے سنہرے ریشمی بال دلیپ کے سینے پر بکھر گئے یکایک وہ جاگ گیا تھا۔ اور نائٹ بلب کی مدھم مدھم دودھیا روشنی میں کیتھی کا پرسکون چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مدہوش کیتھی نے خوابناک لہجے میں کچھ کہا۔ جیسے وہ ٹھیک سے سن نہ سکا۔ شاید وہ محبت کے جزیروں میں انفنن کے ساحلوں پر دصال کی سیپیاں چن رہی تھی۔ اور مسرت کے عالم میں مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ اسی سکوت مدہوشی اور گہری نیند کے عالم میں کروٹ لے کر پلٹ گئی۔ اور اب وہ اس کی پیٹھ دیکھ رہا تھا۔ ستار کی طرح لانبی ریڑھ کی وادی۔ اور وادی کے نیچے وہ پتلی کمر جسے وہ تقریباً اپنی مٹھی میں لے سکتا تھا۔ اور کمر کے نیچے کولہے کا گھماؤ ستار کے جوف کے

مانند۔ دلیپ نے ایک انگلی سے ریڑھ کی وادی کے درمیان سے لے کر کمر تک اس کی پیٹھ پر ایک لکیر سی کھینچی اور سوئی ہوئی کیتھی کے بدن میں لرزشیں جاگ گئیں۔ جیسے نغمہ پیدا ہوتا ہے ستار میں۔ ایسے ہی عورت کے بدن میں۔ ہر سنیچر کو تنجور میں ہر لڑکی ستار بجاتی تھی۔ اس ستار کو دیکھ کر دلیپ کے دل میں کبھی کسی راگنی کا خیال آیا تو کبھی عورت کے بدن کا......

کیتھی اپنا چھوٹا پرس ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھا کرتی تھی۔ اس وقت جو اس نے دوسری طرف کروٹ لی تو سیمل کی روئی والا نرم تکیہ اسکے کندھے کے نیچے سے کھسک گیا اور اس کا چھوٹا پرس خود بخود کھل گیا۔ دلیپ کو اس آدھے کھلے پرس سے ایک چھوٹی سی ڈائری باہر نکلتی نظر آئی۔ دلیپ نے اک اضطراری حرکت سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ دھیرے دھیرے ڈائری کے ورق الٹنے لگا۔ کھاٹ منڈو سچھ اکتوبر بسیما کیفے چار بجے۔ ڈیوڈ شری مالی۔ اننت ناگ......رشیاں رالی......آٹھ پیڈر روڈ فون نمبر ٧٤٧٠٠......٣٨١٩٦٤.....

لیڈ و پیرس۔ اٹھارہ جون۔ جی نیرن وادے۔ نورے واسبنٹ...... فرانسس پنجم گوا...... شمیم...... میسور صندل سوپ...... یکایک دلیپ چونک گیا۔ اس نے جو ورق الٹ دیا اسے پھر پلٹا۔ غور سے دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر دیکھا۔ یہ وہی نام تھا۔ جو اس کی فائل میں موجود تھا۔ جہاں وہ بمبئی سے آگے جانے والے تیجے رنونے کے تیرتے کی تلاش میں۔

میجر ایچ۔ کے۔ ٹالپسا درتہ

کمیل ولا۔ یوس مرگ۔ کشمیر

دلیپ حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ پتہ کیتکی کے پاس کیسے آیا۔ ؟ اور کیوں۔ ؟ آج تک کسی گفتگو میں کیتکی نے میجر ٹاپس ورتھ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ زندگی بھر کے قصے اس نے سنا ڈالے تھے۔ اب دلیپ نے ایک نئی نظر سے کیتکی کی طرف دیکھا۔ یہ سفید فام لڑکی اس کے بستر پر کیا کر رہی تھی۔ ؟ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ ایک اتفاق ہو۔ وہ کشمیر جا چکی تھی۔ کئی بار۔ اس کا ذکر تو کیتکی نے کیا تھا۔ تو یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سیاحت کے دوران یوس مرگ گئی ہو مگر......مگر...... واقعی کیا یہ اتفاق تھا۔ اس کا کیتکی سے ملنا۔ قریب ہو جانا، محبت کرنا۔ آرزوئے وصال کی گھات میں کیا وہ بالکل معصوم تھی۔ ؟ یا کسی سنہری سازش کو لے کر اس کے ساتھ چپاں ہو گئی تھی۔ ؟

دلیپ نے آہستہ سے ڈائری بند کر دی اور اسے واپس کیتکی کے چھوٹے پرس میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ بند کرتے وقت کلک کی تیز سی آواز پیدا ہوئی۔ کسمساتے ہوئے کیتکی نے پھر اس کی طرف کروٹ لی۔ ڈائری سمبل کے تکیے کے نیچے چلی گئی اور وہ پھر اس کی باہوں میں آ گئی۔ دھیرے سے اس نے اپنی لانبی پلکیں اٹھائیں۔ وہ بڑی بڑی روشن آنکھیں دلیپ کے چہرے پر جھانک رہی تھیں۔

"ابھی تک سوئے نہیں کیا۔ ؟"

"سو رہا تھا۔ یکایک جاگ گیا۔"

"میں بھی یکایک جاگ گئی۔ جانے ایسا کیوں ہوا۔ ؟ بڑا اسندر سپنا تھا۔"

"ہاں۔ ؟"

"ہاں۔! میں اور تم ـــ ہم دونوں فرانسس۔ نہیں کارسیکا کے کسی چھوٹے سے سنہری ریت کے ساحل پہ تھے۔ کف اڑاتی ہوئی سبز لہریں ہمارے قدموں پر تھیں۔ ایک ارغوانی رنگ کی چھتری کے نیچے ہم دونوں کے گیلے بدن لپٹے چپٹے پڑے تھے۔ اور ہم دونوں لیٹے لیٹے کہنیوں کے بل اٹھ کر پلیٹ میں رکھے ہوئے سرکے والے سبز زیتون کانٹے سے اٹھا کر ایک دوسرے کے منہ میں ڈال رہے تھے۔ اور جام میں سحر کے پہلے اجالے کے رنگ کی وائین تھی۔ زردی میں سبز رنگ اور سبز رنگ میں سنہرا پن جیسے میری پسندیدہ موصل وائین کا ہوتا ہے۔ ہم دور تک ساحلوں پہ دوڑے تھے۔ ہاتھ میں ہاتھ لے کر دور تک تیرے تھے۔ جھاگ اڑاتی ہوئی نغمہ زار لہروں پہ اور دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہم نے ہونٹوں کی شراب پی تھی۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔"

یکایک کیتھی کے گال گہرے گلابی ہو گئے اور اس نے پلکیں گرا کر اپنا گال دلیپ کے سینے پر رکھ دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "تمہارا سپنا کیا تھا ڈارلنگ؟"

"میں پیرلل بار پہ دونوں بازو رکھے اپنے جسم کو تیر کی طرح سیدھا کر کے اپنے دونوں بازوؤں کے درمیان چکر کھا رہا تھا۔ راؤنڈ اینڈ راؤنڈ اینڈ راؤنڈ اینڈ راؤنڈ۔۔۔۔۔" دلیپ بولا۔

کیتھی دھیرے سے ہنسی۔ غنودگی آمیز آواز میں بولی۔ "توں کھوتنی دا ایں۔!"

"ایں۔؟ یہ کیا۔؟" دلیپ نے چونک کر کہا۔

"ایک سردار جی ٹیکسی والے نے مجھے بتایا تھا کہ میم صاحب جب تم کسی پر بہت نہال ہو جاؤ تو اس کو بولنا۔ "توں کھوتنی دا ایں۔!"

"اچھا نہیں ہے کیا۔؟"

دلیپ جواب تک کیتکی کی بہت سی گالیاں سمجھ چکا تھا۔ بولا۔ "نہیں بہت اچھا ہے۔"

تو کیتکی اس سے زور سے لپٹ گئی۔ اور اپنی انگلی کے نوکیلے ناخن سے اس کے گال پر کچھ لکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہے تو مجھ سے پیار کرو۔ اسی دم۔"

دلیپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ڈائری کا ایک ورق اس کی نگاہوں میں جھلملایا۔ "میجر ایچ۔ کے۔ ٹاپس۔ درنتھ کیمل ولا۔ یوس مرگ (کشمیر)"

مگر اب کیتکی کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔ دلیپ نے جلدی سے ڈائری کے اس ورق کو پلٹ دیا اور آنکھیں کھول کر دھیرے دھیرے کیتکی کے بدن سے کھیلنے لگا۔ وقت آنے پر دیکھ لیں گے۔ ابھی تو اس مومی بدن کو میری باہوں میں پگھلنے دو۔

دن گزرتے گئے۔ رابی اور کمل کا پیار بڑھتا گیا۔ کیتکی اور دلیپ کا التفات بڑھتا گیا۔ رابی کے قیمتی تحفوں سے کمل کا کمرہ بھر گیا تھا۔ دلیپ کی مضبوط باہوں میں کیتکی کے سیماب صفت بدن نے شادابی اور شگفتگی کے سارے مراحل طے کر لئے تھے۔ پھر ایک ایسی ہی رات تھی۔ ان دونوں کے لئے۔ نیم تاریک وصال کی وادیوں میں گھومنے کے بعد دونوں مدہوش سو رہے تھے۔ دلیپ اور کیتکی۔ آج کیتکی دلیپ

کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ یہیں پر انہوں نے ڈنر کیا تھا۔ یہیں پر ڈنر لیا تھا۔ اور اب محبت کے متوالے، ایک دوسرے سے آدھے لپٹے آدھے الگ، سلوٹوں سے بھرے ہوئے بستر کے ساحل پہ مدہوش سو رہے تھے۔

یکایک دلیپ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنی کلائی سے بندھی ریڈیم واچ پر وقت دیکھا۔ رات کے تین بجے تھے۔ پھر اس نے تاریکی میں کیتھی کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ تو کیتھی اس کے ہاتھ نہ آئی۔ ذرا دوسری طرف کروٹ لے کر دلیپ نے ٹٹول کر سوئچ دبا کر بستر کے قریب کا لیمپ روشن کیا۔

ایک دودھیا اجالا سارے کمرے میں پھیل گیا۔

کیتھی اس کے بستر پر نہ تھی۔

"کیتھی ——! کیتھی۔!!" دلیپ نے چند انچ کھلے ٹائیلٹ کی طرف دیکھ کر آواز دی۔

مگر ٹائیلٹ کے اندر سے بھی کسی نے جواب نہ دیا۔

دلیپ انگڑائی لیتا ہوا بستر سے اٹھا اور ٹائیلٹ کی طرف گیا۔ ٹائیلٹ کا دروازہ ذرا سے دباؤ سے کھل گیا۔

کیتھی ٹائیلٹ میں نہ تھی۔

کیتھی کمرے میں نہ تھی۔

یکایک دلیپ پوری طرح جاگ گیا۔ کیتھی اپنے کمرے میں نہ تھی۔ کیتھی، دلیپ کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر کہاں گئی تھی۔ رات کے تین بجے ......؟ کہاں۔؟

دلیپ نے کمرہ کھول کر راہداری میں دیکھا۔ راہداری کے لمبے غالیچے کے

ادھر سے پھول روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ مگر کیتھی راہداری میں بھی کہیں موجود نہیں تھی
یکایک دلیپ کچھ سوچ کر چونکا۔ چونک کر دھیرے دھیرے اپنے کمرے
کی طرف بڑھا۔

اپنے کمرے کے دروازے کے باہر چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے
دھیرے سے اپنے کمرے کے دروازے کی کھنڈی گھمائی۔ دروازہ آپ ہی آپ کھل
گیا۔ بے آواز قدموں سے دلیپ اندر چلا گیا۔

سامنے اس کے بستر پر اس کا سوٹ کیس کھولے کیتھی تلاشی لے رہی تھی۔
آہٹ پاکر کیتھی نے چونک کر اور گردن اٹھا کر دلیپ کی طرف دیکھا۔ ایک دبی سی
چیخ کیتھی کے منہ سے نکل گئی۔

دلیپ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اور ایک عجیب انداز سے
مسکراتا ہوا کیتھی کی جانب بڑھ گیا۔

کیتھی کا رنگ فق تھا۔ دلیپ کی گرفت سے نکلنے کے لئے اسے جو دو چار داؤ پیچ یاد تھے انہیں دوہرانے کے بعد وہ بالکل بے بس ہو گئی۔ دلیپ نے بھی اسے زیادہ نہیں مارا۔ بس ایک چاپ اپنی آدھی طاقت سے استعمال کیا۔ وہ وہیں بیہوش ہو گئی۔ اس نے بیہوش کیتھی کو اٹھا کر ایک کرسی پر باندھ دیا۔ پھر اس کے گالوں کو ہلکا ہلکا سا تھپتھپا کر اسے ہوش میں لایا۔ جب وہ ہوش میں آئی تو بولا۔

"اب بات کرنے کا موڈ ہے۔؟"

کیتھی کچھ نہیں بولی۔

دلیپ نے کہا۔ "سچ اور صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔"

کیتھی پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

دلیپ اس کے قریب گیا۔ اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کے بولا۔ "گدی پر

ایک ہاتھ ایسا دوں گا کہ گردن کا منکا ڈھلک جاوے گا۔ مجھے سچ چاہیئے۔"
کیتی کی آنکھوں میں پہلی بار ڈر کی جھلک پیدا ہوئی اور غصہ اور جھلاہٹ کی جھلک جاتی رہی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔؟ مگر پہلے میری ٹانگیں اور بازو تو آزاد کر دو۔"
"کوئی مضائقہ نہیں۔" دلیپ بولا۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ چابی میرے پاس ہے۔ تم کہیں جا نہیں سکتیں جب تک میں نہ چاہوں۔"
دلیپ نے اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کو گرفت سے آزاد کیا چند لمحے وہ اپنے ٹخنوں اور کلائیوں کا دورانِ خون ٹھیک کرتی رہی پھر اس نے بال جھلا کر رخسار سے پرے ہٹا دیئے اور ڈھٹائی سے دلیپ کی طرف دیکھنے لگی۔
دلیپ نے کہا۔ "میں بہت کچھ جان چکا ہوں مگر تمہاری زبان سے اس کا اقرار چاہتا ہوں۔ تم بمبئی کیوں آئی ہو۔؟"
"جس کے لئے تم آئے ہو۔؟" کیتی بولی۔
"تمہیں کس نے بھیجا ہے۔؟"
"میجر ٹالیس ورتھ نے۔"
اب جا کے دلیپ کو یقین آیا کہ کیتی سچ بول رہی تھی۔
"پھر کیا تمہیں سونے کا پتہ ملا۔؟"
"نہیں۔"

"کیوں نہیں ۔؟"

"وہ بدمعاش مولچند شاہ بہت چالاک ہے ۔ میں نے اس سے جھوٹی محبت کی ۔ اس نے مجھے چند قیمتی تحائف پر ٹرخا دیا ۔ میں نے اسے اپنا بدن استعمال کرنے دیا کہ عورت کے پاس اس سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں ہوتا ۔ مگر میں اس کے سونے کے پترے کے پاس پہونچ نہیں پائی ۔"

"تمہیں معلوم ہے اس نے سونے کا پترا کہاں چھپا کے رکھا ہے ۔؟"

"ہاں ۔"

"کہاں ۔؟"

کیتھی چپ ہو گئی ۔

"بولو ۔"

"اگر بتا دوں تو تم مجھے کیا دو گے ۔؟"

"آزادی ۔"

"یہ کافی نہیں ہے ۔"

"اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گی تو میں تمہاری خوب صورت ٹانگوں کی ہڈیاں توڑ دوں گا ۔ اور تمہیں اس بارہویں منزل سے نیچے پھینک دوں گا ۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا ۔ میں تمہیں چاپ مار مار کر کاغذ کے گودے کی طرح کر دوں گا ۔ پھر تمہیں اس بڑے سوٹ کیس میں بند کر کے سمندر میں پھینک آؤں گا ۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا ۔"

کیتھی کی نگاہوں میں ہراس پیدا ہوا ۔ اس نے حلق سے تھوک نگلا ۔

پھر سر ہلا کر بولی۔ "نہیں، ایسا نہیں کرو گے۔"

"کیوں نہیں۔؟"

"کیوں کہ تم نے مجھ سے محبت کی ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اس محبت کو دیکھا ہے۔"

"وہ وقتی بات تھی۔" دلیپ نے اپنا ہاتھ سخت کرکے آگے بڑھایا۔ ایک حجاب کی صورت کینتھی ڈر کے پیچھے ہو گئی۔ بولی۔ "بتاتی ہوں۔ مگر تم مجھے یورپ واپس جانے کا کرایہ تو دو گے۔؟"

"ہاں۔"

کینتھی کی سنہری زلفیں دونوں طرف رخساروں پر آ نتر آئی تھیں۔ وہ انہیں پیچھے ہٹاتی ہوئی بولی۔ "اس کے بیڈ روم کی مغربی دیوار کے اندر ایک سیف ہے۔ اس سیف کے اندر اس نے وہ سونے کا پترا احتیاط سے رکھا ہے۔"

"تم اسے کیوں حاصل نہیں کر سکیں۔؟"

"میری بدقسمتی۔" کینتھی ہونٹ لٹکا کے بولی۔ "وہ بیلے بوائے ضرور ہے مگر چالاک بھی بہت ہے۔ اس نے مجھے وہ پترا دکھایا۔ اپنی لڑکیوں کو اکثر دکھاتا ہے اسے پھر سیف میں رکھ دیتا ہے۔ جیسے سونے کی کان کا وہی واحد مالک ہے۔"

"سیف کا نمبر معلوم کیا۔؟"

"معلوم کرنے کی کوشش کی مگر معلوم نہ کر سکی۔"

دلیپ کو کینتھی پر کچھ کچھ رحم سا آنے لگا۔ بولا۔

"اس دن جس کسی نے تمہارے کمرے کی تلاشی لی اور تم پر چاقو سے وار کیا۔ وہ کون تھا۔؟"

"مجھے معلوم نہیں وہ کون تھا۔؟"

"پھر تلاشی کیوں لی۔ ؟"

"جس شئے کی اُسے تلاش تھی وہ اسے لے گیا۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے کمرے سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔"

"میں نے جھوٹ بولا۔"

"کیوں۔؟"

"جو چیز وہ لے گیا وہ ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔"

"کیا۔؟"

"میرے سوٹ کیس میں ایک ڈبے میں وہ بند تھی۔"

"کیا۔؟"

"حشیش۔!"

دلیپ سکتے میں آگیا۔ دیر تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تم یہ دھندا بھی کرتی ہو۔؟ چرس۔ افیم۔ حشیش کا۔؟"

"کرتی تو نہیں تھی مگر جب اپنے مشن میں فیل ہوگئی تو سوچا کیا منھ لے کر ماپس ورتھ کے پاس جاؤں گی۔ سوچا۔ کیوں نہ واپس یوروپ چلی جاؤں میں نے ایسا بندوبست کر لیا تھا۔ کہ حشیش کا یہ ڈبہ پار کر لے جاتی مگر مجھ سے پہلے

وہ دوسرا اینٹو پہنچ گیا اور آسے اڑا لے گیا۔"

"وہ دوسرا کون تھا۔؟"

"کہہ دیا ناں۔ میں نہیں جانتی۔ جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ یہاں چکر پر چکر ہے اس دھندے میں اور میں پس گئی تھی اس لئے۔" وہ فقرہ آدھا چھوڑ کر چپ ہو گئی۔

"تو اس وقت میرے کمرے میں رات کو کیا کرنے آئی تھیں۔ میرے سوٹ کیس کی تلاشی کیوں لے رہی تھیں۔؟"

کلیتھی نے اپنی نیلی سرخ زبان ہونٹوں پر پھیری۔ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے ڈرنک دو۔"

"کیا پیئیں گی۔؟"

"برانڈی۔"

دلیپ نے اسے برانڈی دی۔ وہ ہولے ہولے اسے سِپ کرنے لگی۔ پانی یا سوڈا ملائے بغیر...... اس کے چہرے پر رنگت واپس آنے لگی۔

دلیپ نے بڑی کڑی آواز میں اس سے کہا۔

"بہانہ تراشنے کی کوشش مت کرو۔ سچ سچ کہہ دو۔"

وہ بولی۔ "میں تمہارے سوٹ کیس کی تلاشی نہیں لے رہی تھی۔ اس سوٹ کیس کی تہہ میں کچھ رکھ رہی تھی۔"

"کیا۔؟"

کلیتھی اٹھ کر میرے سوٹ کیس کے پاس گئی۔ کھلے سوٹ کیس کے اندر

ہاتھ ڈال کر اس کی تہہ سے اس نے کاغذ کا ایک پیکٹ نکالا۔

"یہ۔"

"یہ کیا ہے۔؟"

"یہ بھی حشیش ہے۔"

"تو یہ میرے سوٹ کیس میں کیوں رکھ رہی تھیں۔؟"

"تاکہ پہلے کی طرح یہ بھی میرے کمرے سے غائب نہ ہو جائے۔ تمہارے کمرے کی تلاشی کوئی نہ لے گا۔ کسی کو تم پر شبہ نہ ہوگا۔"

"پھر کیا ہوتا۔؟"

"میں اس حشیش کو لے کر کھاٹمنڈو جا رہی تھی۔ وہاں کے ہپیوں میں اس کی بہت مانگ ہے۔ میرے وارے کے نیارے ہو جاتے۔ نہ صرف یورپ کا ٹکٹ بلکہ اگلے دو سال تک کچھ کمانے کے دھندے سے آزاد ہو جاتی۔"

"کھاٹمنڈو کب جا رہی ہو۔؟"

"پرسوں۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ میرے کمرے میں رکھا ہے۔ چلو دکھا دیتی ہوں۔ ایک دن بس ایک دن کے لئے۔ یہ پیکیٹ تمہارے سوٹ کیس میں پڑا رہتا۔ پھر میں اسے لیکر کھسک جاتی۔"

"بہت احمق ہو۔"

"دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔" وہ غور سے اپنی انگلیوں کے ناخن دیکھنے لگی۔

"اگر میں سوٹ کیس کھول کر الٹ پلیٹ کرتا تو ممکن ہے اس پیکیٹ پر میری

نظر پڑ جاتی۔"

"میں نے ایک چانس لیا تھا۔ وہ ایک یاس آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اب یہ دوسرا پیکٹ بھی ہاتھ سے گیا۔"

دلیپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔

"یہ تم نے کس طرح اندازہ لگایا کہ جس طرح تم اس سونے کے تپڑے کی تلاش میں آئی ہو۔ اسی طرح ہم بھی آئے ہیں۔"

کیتھی نے سنجیدہ نگاہوں سے دلیپ کی طرف دیکھا۔ بولی۔

"میجر ٹاپس ورتھ نے کہا تھا جس طرح ہم اس سونے کے تپڑے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اور لوگ بھی کر رہے ہوں۔ پھر جس طرح تم دونوں موچند شاہ کے قریب جانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی ہو رہے تھے اس سے بھی مجھے کچھ اندازہ ہوا۔ تمہارے ایسے لوگ تاج میں آکر نہیں ٹھہرتے ...... مجھے کچھ ایسا لگا جیسے تم خود سے نہیں آئے ٹھہرائے گئے ہو۔"

"کیسے تم نے یہ سمجھ لیا کہ میرے ایسے آدمی تاج میں آکر نہیں ٹھہرتے۔؟"

"شامیانہ میں اس دن میں نے تم کو چائے پیتے وقت چائے کی پیالی میں بسکٹ بھگو کر کھاتے دیکھا تھا۔ بس اس سے سمجھ گئی۔"

دلیپ نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ جب وہ فٹ پاتھ پر تھا تو اسی طرح بسکٹ یا سلائیس چائے کی پیالی میں ڈبو کر کھاتا تھا۔ چچا نے اس کی بہت سی فٹ پاتھ کی عادتیں چھڑا دی تھیں۔ مگر کبھی نہ کبھی

کوئی نہ کوئی پرانی عادت تازہ ہو جاتی۔ دل ہی دل میں دلیپ نے کیتھی کی تیز نگاہی کی داد دی۔ واقعی۔

کیتھی اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ یکایک اس نے اپنی دونوں بانہیں دلیپ کی گردن میں حمائل کر دیں۔ اور اس سے لپٹ کر بولی۔

"ڈارلنگ، اس جہنمی کان کا خیال چھوڑ دو۔ شاید یہ سب ایک واہمہ ہے اگر کچھ ہے بھی تو ایک خطرناک کھیل ہے۔ اب کرو۔ میرے ساتھ یوروپ چلے چلو۔ ہم تم دونوں اس حشیش سے جو کچھ حاصل ہوگا۔ آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔"

"ففٹی ففٹی۔؟"

"ہاں۔!" کیتھی اپنا چہرہ اس کے قریب لے جاتے ہوئے بولی۔

"کچھ معلوم ہے، اس وقت تمہارے سوٹ کیس میں کتنے کی حشیش رکھی ہوئی ہے۔؟"

"کتنے کی۔؟"

"تین لاکھ ڈالر کی۔ ڈیڑھ لاکھ تمہارے ڈیڑھ لاکھ ہمارے۔ مزے سے عیش کریں گے۔ میں تمہیں کا رسیکا لے جاؤں گی۔ اس اکیلے سنہرے ساحل پر۔ زرد ریشمی ریت پہ محبت کریں گے۔ کہہ دو ہاں۔ ہاں۔؟"

کیتھی کا چہرہ اتنے قریب تھا کہ وہ اس کی جلتی ہوئی سانس اپنے رخسار پر محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے اپنا منہ موڑ لیا۔ اس عورت کے شدید جذبے نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس لڑکی کا پورا بدن اس کے لئے بے قرار ہے دلیپ نے آہستہ سے اپنا منہ پھیر لیا۔ گو اسے اس حرکت میں خاصی مشکل محسوس ہوئی۔

کیتھی نے کہا: "اس سونے کی کان کو بھول جاؤ۔ شاید وہ ایک سراب ہے ایک سپنا ہے۔ شاید اس کی کوئی حقیقت نہیں مگر یہ تین لاکھ کی حیثیت۔؟ کیا تم ان کے عوض کرنسی نوٹوں کی آواز نہیں سن سکتے۔ تین لاکھ ڈالر کے تازہ کڑکڑے نوٹ ان کی آواز سنو۔"

دلیپ نے وہ آواز سنی۔ جیسے کیتھی کے ریشمی سکرٹ کی آواز۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنے کان بھی تہہ کر لئے۔ بولا۔

"نہیں کیتھی۔ نہیں۔ میں یورپ نہیں جاؤں گا۔ مجھے اس کان کی تلاش ہے۔"

"سونے کی ایک کان تو اسی سوٹ کیس میں بند ہے۔"

یکایک۔ دلیپ کا گھوما ہوا چہرہ واپس کیتھی کی طرف آ گیا۔ دلیپ نے کیتھی کے دونوں شانوں کو بے حد مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

"مجھے اس سونے کی کان کی تلاش نہیں ہے۔ مجھے اپنے باپ کے قاتل کی تلاش ہے۔ جو ان ساتوں میں سے کوئی ایک ہے۔"

"مگر پایس ورنھو۔؟" کیتھی نے سرگوشی سے پوچھا۔

"یہ نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا۔" دلیپ نے گلوگیر لہجہ میں کہا اور یکایک اس نے کیتھی کو چھوڑ دیا۔ کیتھی اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی جھول گئی۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر کے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ بولی:

"اس سوٹ کیس کا کیا ہوگا۔؟"

"یہ میرے پاس رہے گی۔ اس وقت تک جب تک تم کہیں اسے لے جانے

کے لئے تیار نہ ہو جاؤ اور اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تو اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ اگر دوبارہ کسی نے تم پر چاقو سے حملہ کیا تو مجھ سے نہ کہنا۔"

"نہیں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ مکمل بھروسہ ہے۔" کیتھی کے ہونٹ اس کے رخساروں کو ہوا کی مانند چھو گئے اور وہ اس کے کمرے سے نکل گئی۔

دو دن کے بعد کیتھی کھاٹ منڈو چلی گئی۔ دہلی تک وہ راجدھانی ایکسپریس سے گئی تھی۔ ریل گاڑی اس قسم کے کام کے لئے زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ دہلی سے وہ ہوائی جہاز کے ذریعے کھاٹ منڈو جائے گی۔ وہ کچھ لوگوں جانتی تھی۔ نہیں ـــ نہیں۔ اسے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

* * *

پھر ایک دن کھاٹ منڈو سے اس کا خط آیا۔ اب وہ لندن جا رہی تھی۔ لندن میں کچھ دن رہ کر پیرس چلی جائے گی۔ جب پیرس سے اس کا جی اوب جائے گا۔ تو وہ کارسیکا جائے گی۔ گرمیوں کے چند دن وہاں گزارے گی۔ ہر چیز بڑی خوب صورتی، قاعدے اور سلیقے سے طے ہو گئی تھی۔ کارسیکا میں وہ اس کا انتظار کرے گی مگر جوانی زیادہ دن انتظار نہیں کرتی اور ایک بے حد حسین و جمیل لڑکی کیلئے زندگی کی خوشیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ دل کے کسی گوشے میں ہمیشہ اس کی ضرورت محسوس کرتی رہے گی۔ اس نے تار سے میں اپنا مستقل پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ دنیا کے کسی کونے میں وہ ہو، اس پتے پر لکھنے سے اسے ہمیشہ ملیں

کا خط مل جائیگا۔ زندگی ایک گرداب فنا ہے آخر۔ بھنور کے اندر جانے سے پہلے اس کی اوپر کی ہر دل پر جب تک رقص کرلیں بہتر ہے۔ آخر کو تو سب کو اس بھنور میں جانا ہے۔...... پتہ نہیں اور کیا الا بلا اس لڑکی نے اس خط میں لکھا تھا۔ کچھ دلیپ سمجھ سکا۔ کچھ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے کیتھی کا مستقل پتہ نوٹ کرکے خط کو پھاڑ دیا۔ اور بالکونی کے پردے کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ جہاں گیٹ وے آف انڈیا کی دیوار سے لگے کمل اور رادھا سمندر میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہے تھے۔

O

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جسے کھیل سمجھ کر شروع کرو۔ وہ سنجیدہ ہو کر زندگی کا کھیل بن جاتا ہے۔ کیا یہی کچھ کمل کے ساتھ تو نہیں ہو رہا ہے۔ ؟ کچھ عرصے سے دلیپ کمل کی بدلی بدلی نگاہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رابی سے محبت کا کھیل کھیلتے کھیلتے وہ سچ مچ اس کی محبت میں ڈوب رہی ہے۔ دلیپ نے سوچا۔ اب اسے کنارے پر کھینچ لینا چاہیئے کیتھی کے جانے کے دو چار روز کے بعد اس نے کمل سے کہا۔

"آج شام خالی ہے کیا۔ ؟"

"خالی تو نہیں ہے۔۔ مگر۔۔۔ کیوں۔ ؟"

"میں چاہتا ہوں آج تم رابی کے ساتھ ڈنر ٹال دو۔ ہم تم دونوں اپنے کمرے میں کھانا کھائیں گے۔"

کمل نے اسے نئی نظروں سے دیکھا۔ بولی۔ "بات کیا ہے۔ ؟"

دلیپ نے کہا۔ "چند اہم باتیں ہیں۔ اُن پر غور کرینگے۔"

"مثلاً۔ ؟" کمل نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ پیسے ختم ہو رہے ہیں۔" دلیپ نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دکھایا۔ "بیس ہزار کا ڈرافٹ انکل سے اور منگوالیا ہے۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے چچا کے پاس بے اندازہ دولت نہیں ہے۔"

"پیسے کی فکر تم کیوں کرتے ہو۔ ؟" کمل لاپرواہی سے بولی۔

"جتنا چاہو مجھ سے لے لو۔"

"اوہ، یہ بات ہے۔ ؟"

"ہاں یہ بات ہے۔" کمل کے لہجہ میں مضبوطی تھی۔

دلیپ کو کمل کا لہجہ ناگوار گزرا مگر اس نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تو تم شام کا کھانا میرے ساتھ نہیں کھاؤ گی ـــ اکیلے۔ ؟"

"یہ کس نے کہا۔ نہیں کھاؤں گی۔ ؟" کمل کسی قدر آزردگی سے بولی۔

"تو پھر شام کا طے ہے۔ ؟"

"ہاں اگر تم چاہو تو۔"

دلیپ کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ پی گیا۔ آج اس نے ہارڈیکر کے سکول میں تین گھنٹے شدید کسرت کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا ورنہ ممکن تھا کہ وہ کمل پر ہاتھ ہی اٹھا دیتا۔

رات کے کھانے پر ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں تقریباً خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دلیپ نے ایک سگریٹ سلگایا اور جب بیرہ کھانے کی ٹرالی کمرے سے باہر لے گیا تو دلیپ اور کمل دونوں آمنے سامنے صوفوں پر نیم دراز ہو گئے کمل بالکل چپ تھی۔ وہ دیکھتے ہوئے انگارے سے اس کے رخساروں پر ۔۔یاں تھے۔ اور ہاتھوں کی انگلیاں بےچین تھیں۔ جو اس کے دلی کرب کی شاہد تھیں۔ دلیپ نے دھیرے دھیرے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"معاملہ کہاں تک پہونچا۔؟"

کمل بولی۔ "چل رہا ہے۔"

"ہمیں بمبئی آئے ہوئے کافی دن ہو گئے۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔"

"اسی لئے پوچھ رہا ہوں۔ تمہاری اور اس کی دوستی کس منزل پر ہے۔؟"

"اسے مجھ پر بھروسہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"بس۔؟"

"بس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔؟"

"میرا مطلب جسمانی تعلق ہے۔"

"اوہ۔!" کمل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر بپھر کر بولی۔

"تمہیں اس سے کیا۔؟"

"مجھے اس سے صرف اس حد تک تعلق ہے کہ اس سے مجھے معلوم ہو جائیگا۔ معاملہ کہاں تک بڑھا ہے۔"

وہ دیر تک چپ رہی۔ پھر بولی۔ وہ برا آدمی نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہوا ہے خود بخود ہوتا رہا ہے۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر ٹہلے ہیں۔ گھومے ہیں۔ کبھی خود بخود ایک دوسرے کی باہوں میں آ گئے ہیں۔ چوم بھی لیا ہے ایک دوسرے کو......"

"اور اس سے آگے.......؟"

"نہیں ــــ نہیں۔" وہ بڑی سختی سے بولی۔

"تم کیا سمجھتے ہو مجھ کو ــــ میں تمہاری کیتھی کی طرح چھنال نہیں ہوں۔"

یکایک کمل کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "نہ تمہاری طرح آوارہ۔"

اور ــــ یکایک معاملہ دلیپ کی سمجھ میں آنے لگا۔ اور جو کچھ اس کی سمجھ میں آیا۔ اسے سمجھ کر دلیپ کو پسینہ آگیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ پونچھا۔ اپنے جذبات کو قابو میں کیا۔ بولا۔

"مجھے تمہاری ذاتی زندگی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ تم جو کچھ بھی کرو۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اس کے بیڈروم تک پہنچی ہو کہ نہیں، جس کی مغربی دیوار میں وہ سیف ہے، جس میں وہ سونے کا پتر ارکھا ہے۔؟"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں نہیں۔؟"

کمل چپ رہی۔

"یعنی کب تک۔؟"

"مسٹر۔!" کمل بڑے کڑے لہجہ میں بولی۔

"میں ایک حد تک جا سکتی ہوں۔ اس کے آگے وہی مجھے ہاتھ لگا سکتا ہے۔"

جس سے میں شادی کروں گی۔"

"تو کیا تم راہی سے شادی کرو گی۔؟"

"ہو سکتا ہے۔" کمل نے گردن کے خم سے بال جھلاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ اس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی ہے۔"

دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔

کمل بولی۔" یہ میری انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی دیکھتے ہو۔ یہ ہماری سگائی کی انگوٹھی ہے۔"

دلیپ بولا۔" ایسی کئی ہیرے کی انگوٹھیاں اس نے دوسری لڑکیوں کو پہنائی ہوں گی۔"

"ہو سکتا ہے مگر مرد سے زیادہ عورت جانتی ہے کب مرد سچ بولتا ہے۔ کب سچ کے پردے میں جھوٹ بولتا ہے۔"

"وہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔؟"

"وہ جھوٹ کا کھیل کھیلتے کھیلتے سچ کی طرف چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے۔ اس دفعہ وہ مبہت گمبھیر طریقے سے مجھ سے شادی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔"

"اور تم کیا سوچ رہی ہو۔؟"

یکایک کمل کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ جیسے وہ دلیپ کو راز میں لیتے ہوئے کہہ رہی ہو۔ "دو تین دن سے میں بھی عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں۔ وہ مجھ سے جلد سے جلد شادی کرنے کا خواہشمند ہے۔ آجکل پرسوں۔ جب چاہو۔ وہ مجھ سے کہتا ہے۔"

"اور تم کیا چاہتی ہو۔؟"
"میں کہتی ہوں۔" کمل نے دلیپ کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر کہا۔
"کیوں نہ میں اس سے شادی کر لوں۔"
"اور وہ سونے کی کان۔؟"
"راجی خود ایک سونے کی کان ہے۔ میں اس منحوس سونے کی کان کیلئے کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالوں۔ راجی مجھے سب کچھ دے سکتا ہے۔ گھر، گاڑی دولت۔ سیکیورٹی۔ بغیر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے ہوئے۔ جب مجھے وہ سب کچھ مل سکتا ہے۔ جو میں چاہتی ہوں تو میں ایک سپنے کی خاطر، جو ایک حقیقت ہے اور جو میری مٹھی میں ہے اسے اپنی جیب میں کیوں نہ ڈال لوں۔"
"تم جانتی ہو۔ سونے کی کان ایک سپنا نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے۔"
"ہوگی۔ مگر اس تک ہم پہونچے نہیں ہیں۔ ممکن ہے کبھی نہ پہونچیں بلکہ ہے پہونچنے سے پہلے مار دیئے جائیں۔ میری سونے کی کان مجھے بمبئی میں مل گئی۔"
دلیپ نے محسوس کیا جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک رہی ہو۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔؟"
"کیا تم سن رہے ہو۔؟"
"وہ ایک پلے بوائے ہے۔ وہ تم سے شادی کر کے بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ عشق لڑاتا پھریگا۔"
کمل برافروختہ ہو کے بولی۔ "وہ ایک پلے بوائے ہے۔ تو تم کون سے فرشتے ہو۔؟ یہاں کیتھی۔ وہاں بھاماں۔ اس سے پہلے نجانے کون۔؟"

دلیپ سمجھو نچکا رہ گیا۔ کیبتی کا تو خیر کمل کو علم ہو سکتا تھا۔ مگر بھاماں کا اسے کیسے پتہ چلا۔؟ وہ بالکل حیرت زدہ رہ گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمل کی طرف دیکھنے لگا۔ کمل مزا لے رہی تھی۔

" تمہیں کیسے ...... تمہیں کیسے ...... بھاماں ......" دلیپ نے بڑی بے ربطگی سے کہا۔

" مجھے سب معلوم رہتا ہے۔ مسٹر۔"

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر دلیپ بولا۔

" تو گویا تم اس سکیم کو بیچ میں سے چھوڑ دو گی۔ ؟"

کمل بولی۔ " تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے۔ پہلے میں تمہاری ففٹی ففٹی کی پارٹنر تھی۔ اب تم اکیلے اس کان پہ قابض ہو سکتے ہو۔ گوڈ لک۔!"

" لیکن تمہاری مدد کے بغیر وہ سونے کا پترا مجھے کیسے مل سکتا ہے۔ جو مولچند شاہ کی تجوری میں ہے۔ ؟"

" ظاہر ہے وہ اب تمہیں نہیں مل سکتا۔ وہ سونے کا پترا اب رابی کی تجوری میں رہے گا۔ کیونکہ اب میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔"

" کیا۔ ؟" اکدم دلیپ صوفے سے اچھل کر چیخا۔

" میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

وہ کمل کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر یکایک اس کے قدم رک گئے۔ کمل کے ہاتھوں میں پستول تھا۔

کمل بڑی مضبوطی سے بولی۔ " میرا اندازہ تھا۔ یہ وقت آئے گا۔ میں

اس کے لئے تیار تھی۔ ایک قدم اور آگے بڑھے تو گولی مار دوں گی۔ میرے راستہ سے ہٹ جاؤ اور اچھی طرح سمجھ لو۔ ابھی اسی وقت میں مولچند شاہ کے گھر جا رہی ہوں۔ تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔"

"کیا بکتی ہو تم ...... وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ ہم تم دونوں شادی شدہ ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے اسے بتایا ہے کہ تم اور میں شادی کرنے والے تھے اسی لئے الگ الگ کمروں میں رہ رہے تھے۔ اپنی حفاظت کے خیال سے میں نے اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کیا مگر اب میں نے تم سے شادی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"

"کیونکہ تمہیں اس پلے بوائے سے محبت ہو گئی ہے۔"

"بالکل۔"

"اور اس نے یقین کر لیا۔؟"

"وہ میری سچی محبت میں یقین کرتا ہے۔ اسے میں نے ایک ریشمی ڈوری کی طرح اپنی انگلی کے گرد لپیٹ لیا ہے۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔ مسٹر۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔ گڈ بائی ......"

کمل، دلیپ کی طرف پستول تانے الٹے قدموں سے دروازے تک گئی بڑی احتیاط سے اس نے مڑے بغیر دروازہ کھولا۔ چابی ہاتھ میں لی اور دروازے سے باہر نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا اور چابی اپنے ہاتھ میں لے کر اسے جھلاتی ہوئی اپنے کمرے کے اندر چلی گئی۔

دلیپ کچھ دیر تو ہکا بکا بیٹھا رہا۔ حالات نے کیسا غلط موڑ لیا تھا۔ اور اب وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ مولچند شاہ سے کہے کہ وہ دونوں کیا اسکیم بنا کر بمبئی آئے تھے تو اول تو وہ یقین بھی نہیں کریگا۔ اور اگر یقین کرے بھی تو وہ اس بری طرح کمل کے چکر میں پھنس چکا تھا کہ آسانی سے اس کے جال سے نکل نہیں سکے گا۔ اور اگر یقین کر بھی لے تو سونے کے بترے کے سلسلہ میں بالکل محتاط ہو جائے گا۔ ممکن ہے اُسے اپنے گھر کی تجوری سے نکال کر کسی بینک میں۔ ؟ وہ کیسے معلوم کر سکتا ہے۔ دلیپ کو اتنا ضرور محسوس ہوا کہ کمل کے جانے سے اس کا دایاں ہاتھ بیکار ہو گیا ہے۔ وہ کمل کو زیادہ مطعون نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی بھی لڑکی ان بدلے ہوئے حالات میں یہی کرتی اگر وہ خود لڑکی ہوتا اور رانی ایسا کر دیتی اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تو ممکن ہے وہ خود بھی یہی کرتا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ وہ ہائی سوسائٹی کے ماحول میں اپنے آپ کو

کسی حد تک اجنبی سمجھتا تھا. چچا کی تعلیم و تربیت نے اس پر تہذیب کا ایک ہلکا سا ملمع تو چڑھا دیا تھا مگر اندر سے وہ اپنے چھوٹے بازار اس کی گلی کا دادا ہی رہا. وہاں پہ وہ زیادہ سکون اور اطمینان سے رہتا تھا. یہ ضرور ہے کہ اسے اب آرام وہ زندگی کی چاٹ پڑ گئی تھی. مگر اندر ہی اندر کہیں پر اس کا ذہن اس سے بغاوت بھی کرتا تھا.

دو راتیں اس نے مولچند شاہ نواس کے آس پاس گزاریں. اس محل نما گھر کے چاروں طرف اونچی دیوار تھی. اور اس دیوار کے اوپر تین فٹ کا اونچا ایک مضبوط آہنی جنگلہ تھا. جس میں بجلی کی رَو پھرتی تھی. اور محل کے دروازے پر کبھی دو کبھی چار مسلح گارڈ ہمیشہ موجود رہتے. اجازت کے بغیر ایک چڑیا تک اندر نہیں جا سکتی تھی. اگر وہ ان دو راتوں میں کسی طرح دیوار پھاند کر دوسری طرف محل کے باغ میں اترنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو کسی نہ کسی طرح رانی کے بیڈ روم تک پہونچ سکتا تھا. مگر دیوار کے اوپر دوڑنے والی برقی رو نے اس کی اس اسکیم کو بھی ناکام بنا دیا. اس نے کمل پر بھروسہ کیا تھا اور اس قدر بھروسہ کر کے بہت برا کیا تھا.

مگر اب کیا ہو سکتا ہے ـ؟

یکایک وہ اس پورے جھمیلے سے بیزار ہو گیا. وہ اپنی گلی کی چھوٹی سی دنیا میں کتنا خوش تھا. کہاں وہ پھنس گیا اور کیوں ـ؟ چچا کے کہنے میں وہ کیوں آیا. سونے کی کان پا کر بھی وہ کیا کریگا. اس کے پاس ایک سوٹ ہو یا دس سوٹ ہوں. ایک کار ہو یا دس کاریں. دس کاریں ایک کار کے برابر ہیں. دس سوٹ ایک سوٹ کے برابر ہیں. اگر صحت نہیں ہے تو چار ہاتھ لمبے فرانسیسی نام کے اندر چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے چکن کے ٹکڑے. کو کھانے میں کیا مزہ ہے.

وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔

اپنے چچا کے پاس وہ واپس جا نہیں سکتا۔ اب تک وہ اپنے چچا کے مزاج سے خاصہ واقف ہو چکا تھا۔ اس کا چچا اسے اس طرح بے نیل و مرام آتے دیکھ کر کان پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیگا۔ یہاں بمبئی سے سونے کا پتر اب وہ کسی طرح حاصل نہیں کر سکتا۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ اپنی گلی کو لوٹ جائے اور یا — یا — یا کیا ؟ یکایک اس کے دل میں بھاماں کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ پیاری معصوم سی پہاڑی لڑکی اب تک اس کا انتظار کرتی ہو گی۔ وہ اس کے پاس چلا جائیگا۔ اور وہ اس بڑھیا کے کھیتوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور زندہ رہنے کے لئے زیادہ کیا چاہیئے۔ یکایک وہ اس بمبئی کی شہری زندگی اور اپنے چچا کی شہری زندگی اور اس کی چمک دمک سے بیزار سا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہاڑ اور جھیڑھ کے جنگل اور نیلا پھیلا ہوا آسمان اور اس آسمان کے نیچے اخروٹ کے چھوٹ نارے میں بیٹھی ہوئی آنسو پونچھتی ہوئی بھاماں اسے نظر آئی۔ وہ یقیناً کل ہی تاج چھوڑ دیگا۔ ابھی بیس ہزار سے کچھ اوپر روپیہ اس کے پاس تھا۔ ان روپوں سے وہ بھاماں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر سکتا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا۔ کل ہی وہ بمبئی سے چلا جائے گا بمبئی سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی اور دہلی سے براستہ ریل گاڑی دہرہ دون اور دہرہ دون سے بھاماں کے گاؤں ......

یوں سوچتے سوچتے اس کی دلی بشاشت عود کر آئی۔ تہذیب نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہونچایا تھا۔ اس کے دل میں آڑے ترچھے پیچیدہ خیال نہیں سماتے

تھے۔ ابھی تک وہ ایک سادہ لوح نوجوان تھا۔ اپنی جبلتوں اور حسیات کا کہا ماننے والا اور جب اس نے یوں سوچ لیا تو اس نے دلی کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ کٹا لیا۔

کل شام وہ ہوٹل کا باقی ماندہ بل ادا کر کے ساڑھے سات بجے شام کی فلائیٹ سے دلی کے لئے روانہ ہو جائے گا۔

٭ ٭ ٭

تکبیر، رانی کی پارٹنرشپ میں جوہو کے ساحل پہ ایک نیا ہوٹل مغربی سیاحوں کے لئے تعمیر کر رہا تھا۔ اس وقت وہ دونوں وہاں سے لمبی ڈرائیونگ کے بعد ہار بر بار میں بیٹھے تھے۔ تکبیر کے پاس بلڈی میری کاک ٹیل تھی۔ رانی کے پاس ایک مین ہٹن کاک ٹیل۔

تکبیر اپنے گلاس میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"سنا ہے تم کمل سے شادی کر رہے ہو۔؟"

"ہاں۔"

"کون سی والی۔؟"

"جیسی اب تک چھ سات کر چکا ہوں۔ ثبوت کوئی باقی رہتا نہیں پھر لڑکی سے اُکتا کر اسے خاصی رقم بھی دے دیتا ہوں۔ وہ کورٹ میں نہیں جاتی ہے۔ جائے بھی تو ثبوت کیا ہے۔؟"

"ایک دن پکڑے جاؤ گے۔" تکبیر بولا۔

رابی نے اس کی بات طنزاً دوہرائی۔ "ایک دن پچھتاؤ گے۔"
اور قہقہہ مار کر بولا۔ "تم روپے کی طاقت کو سمجھتے ہو پھر بھی ایسا کہتے ہو۔"
"شاید یہ لڑکی ایسی نہ ہو۔ مجھے یہ لڑکی مضبوط کیریکٹر کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی ایک عجیب سی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک پُراسرار سی جھلک ......!"
"یہ پُراسراریت لڑکیاں اپنے اردگرد پیدا کرلیتی ہیں۔ مرد کو موہنے کے لئے۔ ورنہ دراصل بالکل سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ اوپر کی منزل ــــ" اتنا کہہ کر رابی نے اپنے ماتھے کو کھٹکھٹایا۔ "اوپر کی منزل اکثر بالکل خالی ہوتی ہے۔"
"بچ کے رہنا بیٹا۔" لکھبیر ایک لمبا گھونٹ لے کر بولا۔
"ایک دن ایسے پھنسو گے کہ یہی نقلی شادی اصلی شادی میں تبدیل ہو جائیگی۔"
"اصلی شادی تو میں وہاں کروں گا جہاں ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں۔"
"یعنی۔؟"
"یعنی جہاں ایک پلڑے میں مجھے اور میری وجاہت، میرے خاندانی تعلقات اور میرے روپے کو ڈالا جائے اور دوسری طرف لڑکی کے حسن، خاندانی شرافت اور دولت کو رکھا جائے تو دونوں پلڑے قریب قریب برابر رہیں۔ وہیں میری شادی ہو سکتی ہے۔"
"یعنی وہ لڑکی جو خوب صورت ہو۔ خاندانی ہو اور جہیز میں دو ایک ملیں یا فیکٹریاں لانے کی سکت رکھتی ہو۔؟"
"ہاں۔ بالکل ایسی ہی۔!"

"کمل خوب صورت تو بہت ہے۔ خاندانی بھی لگتی ہے۔ مگر رو پئے والی نہیں معلوم ہوتی۔ لگتا ہے۔ خود کسی امیر شوہر کی تلاش میں ہے۔" لکھبیر نے کمل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ اس وقت دونوں کے درمیان موجود نہ تھی۔

"وہ امیر شوہر تو سمجھو اسے ٹیمپریری طور پر مل گیا۔" رانی ہنسنے لگا۔

"بڑی کاروباری ذہنیت ہوتی جارہی ہے تمہاری۔" لکھبیر نے کہا۔

"ایک دن ایسا آئیگا جب تم ایک حسین لڑکی اور کار پچ کے ایک حسین پاؤں میں کوئی تمیز نہ کر سکو گے۔"

"اسی دن میں سچ مچ کی کوئی شادی کروں گا۔"

"تو اس عارضی شادی کے بعد کہاں جارہے ہو۔ ہنی مون منانے۔"

"کمل نے سوئیزرلینڈ کے لئے کہا ہے۔ سوائے سوئیزرلینڈ لے جاؤں گا۔"

اتنے میں سامنے سے کمل آتی دکھائی دی۔ اس لئے یہ گفتگو ختم ہو گئی

* * *

ڈنر ختم ہو چکا تھا۔ خدام مؤدب کھڑے تھے۔ پھر ڈسرٹ آگیا۔ کٹ گلاس کی دو چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ہاف سے ئے لئے کمل کا ڈسرٹ ہلکی پیلی رنگت لئے ہوئے چمک رہا تھا۔

رانی نے کہا۔

"ڈسرٹ بیڈروم میں لے آؤ۔"

بٹلر ذرا سا مؤدب جھکا۔ جیسے اس نے سُن لیا ہو اور جب سنا ہے تو حکم کی تعمیل بھی ہو گی۔

کمل نے ہلکی گلابی رنگ کی میکسی پہن رکھی تھی۔ بال ہیر ڈریسر نے نئے ڈھنگ سے سنوارے تھے۔ میکسی کمر کے نزدیک بہت تنگ تھی۔ اوپر سینے کے اُبھار کے قریب دونوں طرف سرخ ریشم کی ڈوریاں اوپر کو جاتی تھیں۔ جیسے دو طرف سے کسی مرد کی انگلیاں سینے کے ابھار کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ قیمتی لباس۔ قیمتی خوشبو اور آنکھوں میں وہ قیمتی چمک جو عورت کے دل میں اپنے حسن کے قاتل احساس کے بعد آتی ہے۔

رابی، کمل کی کرسی کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ کمل اٹھی بڑی شائستگی سے رابی نے کمل کی کرسی پیچھے کی پھر دھیرے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بیڈ روم کی جانب لے گیا۔

بیڈ روم میں کریم کلر کی دیواریں تھیں۔ چھت پر ایک استنبولی فانوس تھا جس میں ہرے اور گلابی بلور لٹکے تھے۔ رابی نے بٹن دبا کر ہرے بلور کی روشنیوں کو آف کر دیا۔ سارے کمرے میں ہلکا ہلکا گلابی رنگ چھا گیا۔ جہاں کمل بیٹھی تھی اس کے قریب بھی ایک گلابی لیمپ شیڈ سے ہلکی گلابی روشنی چھن کر کمل کے چہرے کو منور کر رہی تھی۔

رابی سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں بٹلر اندر آ گیا۔ اس نے دونوں صوفوں کے درمیان والی لانبی مستطیل تپائی پر کمل دسونفٹ کی شراب کے دو جام رکھے۔ وہ دونوں اٹھتے ہوئے بوسے کھینچنے لگے۔

کچھ بے چین ہو کر رابی صوفے سے اٹھ کر اپنے بستر پر گیا۔ کنگ سائز بیڈ کا بہت بڑا بیڈ تھا۔ سر کی طرف روز ووڈ کی جالیوں میں سمندر سے نکلتی ہوئی جل پریوں کے عریاں جسم تھے۔

رابی نے کہا۔

"یہاں بستر پر آ جاؤ۔"

کمل اٹھی اور بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے دیکھا۔ چھت کے اوپر فانوس کے چاروں طرف ایک گول آئینہ پھیلا ہوا تھا۔ جس میں وہ اپنے آپ کو نیم دراز حالت میں دیکھ سکتی تھی۔ رابی اور کمل کے بیچ میں ساٹن کے دو تکیئے تھے۔ کمل کا ایک ہاتھ ساٹن کے تکیئے پر تھا۔ رابی اس ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلنے لگا۔

بولا۔ "کل ہماری شادی ہے۔"

"ہوں۔!" کمل دھیرے سے بولی۔

"اور آج میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔"

"کیا۔؟" کمل نے مست نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

رابی نے دیوار میں چھپا ہوا ایک بٹن دبایا۔ یہ مغربی دیوار تھی۔ دھیرے دھیرے کسی دھات کے پترے کے سرکنے کی آواز پیدا ہوئی۔ اب دیوار کے اندر ایک تجوری نمودار ہوئی۔ رابی نے کئی نمبر ملا کر اسے کھولا۔ کمل نے نمبر یاد کرنے کی کوشش مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ بالکل رابی کے قریب چلی گئی۔

رابی نے سیف کے اندر ہاتھ بڑھا کر زمرد کا ایک گلوبند نکالا۔ اور اسے کمل کے سامنے لاکر بولا۔ "یہ۔!"

"ہائے رام ——! یہ تو زمرد کا گلوبند ہے۔ کئی لاکھ کا ہوگا۔"

"تم پر نچھاور ہے۔" رابی اپنی آواز میں لاپروائی لاتے ہوئے بولا۔

"ذرا گھوم جاؤ۔ تو میں تمہیں پہنا دوں۔"

کمل گھوم گئی۔

رابی نے اسے گلوبند پہنا دیا۔

کمل کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔

رابی نے گلوبند پہناتے ہوئے کمل کی گردن کو بوسہ دیا۔

پھر جو اس نے بٹن دبایا تو فانوس کے لال بلّور بجھ گئے اور ہرے بلّور چمکنے لگے۔ ان ہرے بلّور کی روشنیوں میں زمردیں گلوبند کا ہرا رنگ اور بھی بہار دینے لگا۔

کمل نے بچوں کی طرح اٹھلا کر کہا۔

"آج تمہارا سیف دیکھوں گی۔"

"دیکھ لو۔"

"اس میں ہے کیا۔؟"

"کچھ زیورات ہیں۔ کچھ کرنسی نوٹوں کی گڈیاں۔ کچھ ڈالر۔ کچھ ہنڈیاں۔ کچھ ضروری کاغذات۔ تمہیں کیا چاہیئے۔؟"

"تم —— اور صرف تم کو چاہتی ہوں میں۔"

رابی خوشی سے مسکرانے لگا۔

یکایک کمل کی نظر سونے کے ایک بتر سے پر پڑی جو سیف کے ایک کونے

میں چمک رہا تھا۔ کمل نے اسے اٹھا کر رابی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے۔؟"

"سونے کا ایک پترا ہے۔"

"اتنا قیمتی ہے کہ تم اسے اس بیگ میں رکھے ہوئے ہو۔؟" کمل نے اس سے پوچھا۔

"یہ اس بیگ میں سب سے قیمتی شئے ہے۔"

"یہ۔؟ ایک چھوٹا سا سونے کا پترا۔؟"

"یہ سونے کا چھوٹا سا پترا سونے کی ایک کان کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ میرا Eldorado ہے۔ جب کبھی میرے پاس پیسے کم پڑے، میں اس کان سے سونا حاصل کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے۔؟"

"میرا ایک دوست ہے۔ میجر ٹالپس ورتھ۔ کشمیر میں رہتا ہے۔ اس سے فٹ ہوتا ہوا سونے کا پترا اس کے پاس ہے۔ میری اس کی خط و کتابت چل رہی ہے۔ جلد ہی ہم ایک پارٹی تیار کر کے اس کان کی تلاش میں نکلیں گے۔ کوئی چھ ماہ بعد۔

"کیوں، کیا چھ ماہ میں تمہاری دولت ختم ہو جائے گی۔؟"

"نہیں۔ ابھی اتنی دولت موجود ہے کہ میں جس رفتار سے چل رہا ہوں چھ، سات سال گزار لوں مگر پیش بندی لازمی ہے۔ اس لئے میجر ٹالپس ورتھ کی ساجھے داری میں ایک ایکسپی ڈیشن کی سوچ رہا ہوں۔"

"اگر چلن سے چلیں۔" کمل بولی۔

"تو جتنی دولت تم بتاتے ہو، ہم دونوں کے لئے زندگی بھر کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کھلے ہاتھ کو روکنا بھی مشکل ہے۔"

"بیوی اور کس کام کے لئے ہوتی ہے۔؟"

"تمہارے ایسی بیوی تو صرف محبت کرنے کے لائق ہوتی ہے۔" رابی ہنسا۔ پھر اس نے سونے کے پتر سے کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس وقت کمل کی مٹھی میں تھا۔

"لاؤ ــــ اسے سیف میں رکھ دوں۔"

کمل نے سونے کا پترا اسے واپس کر دیا۔

جب رابی سونے کا پترا سیف میں رکھ رہا تھا، یکایک اس نے کمل کا ہاتھ زور سے اپنی گردن پر پڑتا محسوس کیا۔ پھر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس کے ہوش و حواس مکمل تاریکی میں چلے گئے۔

کمل نے بیہوش رابی کو آرام سے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ زمرد کا گلو بند اتار کر واپس میں رکھ دیا۔ سونے کا پترا اٹھا کر اپنے پرس ڈال دیا۔

کمل نے رابی کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کی ضرب اس نے نرم دلی سے لگائی تھی۔ بس آدھا چاپ۔ رابی گو اوپر سے دھیمہ تھا مگر اندر سے پلپلا تھا۔ اب یہ صبح تک آرام سے سوئے گا۔ اس سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں۔

کمل نے رابی پر ایک ریشمی چادر اڑھا دی۔ روشنی بند کر کے اور دروازہ بھیڑ کر باہر چلی گئی۔ لاؤنج میں جا کے اس نے شبلر سے کہا۔

"صاحب سو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے۔ انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ صبح ساڑھے چھ بجے جائے پیئیں گے۔"

تیکر نے مودبانہ طریقے سے سر ہلا دیا۔

"میرے لئے ایک گاڑی منگادو۔ میں ہوٹل جارہی ہوں۔"

رادھا کی ماں مٹھا میں بیٹھ کر کمل تاج چلی گئی۔

٭ ٭ ٭

دلیپ سانتا کروز ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ساڑھے سات بجے کا پلین ڈھائی گھنٹے لیٹ تھا۔ کرب اور غصہ کے عالم میں دلیپ اپنی سیٹ پر بیٹھا پیچ وتاب کھاتا رہا۔ وہ ایک منٹ کے لئے اس منحوس بمبئی میں نہیں ٹکنا چاہتا تھا۔ اور اب اسے ڈھائی گھنٹے مزید انتظار کرنا تھا۔

وہ سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ (Snacks) والی کونٹر پر جاکر اس نے ایک ہمبرگر کھایا۔ وہ بیٹھا پیتا رہا۔ آخر میں گرم گرم کافی پھر سگریٹ پر سگریٹ۔ بالآخر کسی طرح وقت ختم ہوا اور لاؤنج کے مائیکروفون پر جبل پور جانے والے مسافروں کو ہوائی جہاز میں جانے کے لئے صدا آنے لگی۔

٭ ٭ ٭

اب وہ ہوائی جہاز میں کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کی ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ جہاز دھیرے دھیرے مسافروں سے بھر رہا تھا۔

یکایک جب جہاز پر سارے مسافر چڑھ گئے اور باہر جہاز سے لگا ہوا زینہ جہاز سے الگ ہونے کو تھا۔ ایک لڑکی ہاتھ میں پرس جھلاتی ہوئی ہوائی جہاز کے اندر چلی گئی۔ ایر ہوسٹس نے ایئر ٹائیٹ دروازہ بند کر دیا۔ باہر کا زینہ الگ ہوکر رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا۔

انجن گرم ہونے لگے۔ مسافر ہدایت کے مطابق بیلٹ باندھنے لگے۔ یکایک دیپ کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کی خالی سیٹ پر آ کے بیٹھ گیا ہے۔ یکایک وہ اسے دیکھ کر چونکا۔

یہ کمل تھی۔

کمل نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے اپنا بڑا پرس کھول کے اس میں سے چھوٹا پرس نکالا۔ اور اس پرس میں سے کاغذ میں لپٹے ہوئے ایک چھوٹے سے پارسل کو نکال کر دیپ کی ران پہ گرا دیا۔

دیپ نے خاموشی سے کاغذ کے اس پارسل کو کھولا اور کھول کر جلدی سے بند کر دیا۔

کاغذ کی تہوں کے اندر راجی والا سونے کا پترا تھا۔

دیپ نے مسکرا کر، انتہائی شاداب ہوکر کمل کی طرف دیکھا مگر کمل اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کمپیکٹ میں دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کی لالی ٹھیک کر رہی تھی۔

دیپ نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔ بولا۔

"میں نے تمہیں غلط سمجھا۔"

کمل بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"تم نے ہمیشہ مجھے غلط سمجھا ہے اور ہمیشہ غلط ہی سمجھتے رہو گے"

اتنا کہہ کر وہ پھر لپ اسٹک ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ہیری ٹالپس ورنتھ کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کا گٹھا ہوا کسرتی بدن
اس کی عمدہ صحت کی گواہی دیتا تھا۔ چوڑے چوڑے ہاتھ اور گندمی رنگ اور چمکتی
ہوئی سیاہ آنکھیں، بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے۔ میجر کے عہدے سے ریٹائر
ہو کر اس نے یوس مرگ میں ایک بنگلہ اپنے رہنے کے لئے بنوایا تھا اور اس کے ارد
گرد سیبوں کا ایک باغ لگایا تھا اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے کشمیر کے
اس خطے سے بڑی محبت تھی۔ بہت سے اینگلو انڈین، انگریزوں کے بعد ہندوستان
سے ہجرت کر گئے تھے مگر ہیری اپنے بنگلے، اپنے باغیچے کے پھولوں اور اپنے باغ کے امبری
سیبوں کی دیکھ بھال میں لگا رہا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کی بیوی مر چکی
تھی۔ کسی طرح کی پریشانی اسے اس دنیا میں سہنا نہیں تھی۔
آرمی میں بھی اس کا شمار بہترین شکاریوں میں ہوتا تھا۔ اس شغل کو اس نے

اب تک جاری رکھا تھا۔

اس وقت وہ اپنے بیڈروم سے ایک چھوٹا سا آہنی سیف اٹھائے ہوئے باہر لکڑی کے چھتے ہوئے برآمدے میں آرہا تھا جہاں عشق پیچاں کی بیلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ سیف اٹھائے ہوئے وہ سردار بلونت سنگھ کے سامنے آیا اور سیف کو ٹیبل پر رکھ کر اُسے کھولنے لگا۔

سیف کھول کر اس نے سونے کا ایک پترا نکالا اور سردار بلونت سنگھ کو دکھانے لگا۔ سردار بلونت سنگھ نے اپنی محدب عینک کے شیشے صاف کئے اور غور سے سونے کے اس پترے کو دیکھنے لگا۔ اور ہیری ٹامپسن ورتھ اس سونے کے پترے کی کہانی از خود بیان کرنے لگا۔

"یہ اس سونے کی کان کے نقشے کا ایک حصہ ہے جس کا ذکر میں تم سے پہلے کر چکا ہوں۔ نقشے کا یہ حصہ نواب نے مرتے سمے مجھے دیا تھا کیونکہ ایک بار جب وہ اس علاقے میں شکار کھیلنے آیا تھا، میں نے ایک باگھ کے حملے سے اس کی جان بچائی تھی، اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر۔ میری کلائی پر جو یہ تم گھاؤ کے نشان دیکھتے ہو یہ اسی باگھ سے لڑنے کے نشان ہیں۔ نواب میری بہادری اور جیداری کو کبھی نہیں بھولا۔ اور مرتے وقت اس نے مجھے یاد کیا اور سونے کا یہ پترا مجھے عطا کیا۔"

"یہ اس سونے کی کان کا ایک حصہ ہے۔!" سردار بلونت سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں۔!"

"مگر جب تک باقی حصے نہ ملیں۔ اس پترے سے کیا فائدہ۔؟"

"غور سے سنو۔" ہیری اس سے کہنے لگا۔

"دو سال ہوئے مولچند شاہ نام کا ایک امیر نوجوان بمبئی سے یہاں سیر و سیاحت کے لئے آیا تھا۔ اِدھر آتے ہوئے راستہ میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ پھر بارش اور طوفان نے اسے گھیرا۔ بڑی مشکل سے وہ اس رات میرے بنگلے تک پہونچ سکا۔ میں نے اسے رات کو پناہ دی۔ ہم دونوں دیر تک پیتے رہے۔ باتوں باتوں میں اور شراب کے نشے میں اس نے ایک سونے کے پترے کا ذکر کیا۔ جو اس کے پاس تھا۔ اور جب میں نے اور اس نے اپنے دونوں پترے ملائے تو وہ دونوں ایک دوسرے پر فٹ بیٹھ گئے۔ ان دونوں پتروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے پترے کا نقشہ جموں تک آتا تھا۔ اور میرے پترے کا نقشہ یوس مرگ کی اس وادی تک پہونچتا تھا۔ قیاس غالب ہے کہ سونے کی وہ کان یوس مرگ سے آگے کہیں ہوگی۔ اسی نقشے کو اپنے ذہن میں رکھ کر میں نے یہاں بنگلہ بنایا ہے۔ اور سیب کا باغ لگایا ہے۔ ہر سال میں اس مقام سے مختلف سمتوں کو پہاڑوں میں جاتا ہوں اور اس کان کو تلاش کرتا ہوں۔ مگر نتیجہ صفر۔ پچھلے سال جب میں شمالی سرحد کی جانب گیا تو ایک بہت ہی دشوار گزار وادی میں مجھے دریائے بلدان کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڈھا سونووال ملا۔ ملوٹ نام کے گاؤں میں۔"

"سونووال کس کو کہتے ہیں۔" بلونت سنگھ نے پوچھا۔

"سونووال وہ لوگ ہوتے ہیں جو دریاؤں، ندی، نالوں کی ریت چھان کر اس میں سے سونا نکالتے ہیں۔ یہ ایک بے حد تکلیف دہ مشقت کا کام ہے اور یہ ریت چھانتے چھانتے سونووال کو پانچ روپے سے زیادہ کا سونا نہیں ملتا۔ اور نہ یہ سونا ہر دریا، ندی، نالوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ اس سونووال کے یہاں میں

رات کو ٹھہرا اور اس سے اچھا سلوک کیا۔ اسے شراب پلائی۔ کھانا کھلایا۔ پندرہ روپے انعام میں دیئے تو اس نے مجھے بتایا کہ بلدان کے دریا میں سے اسے پانچ چھ دفعہ سونے کے دو دو تین تین تولے کے نگٹ (Nagget) یعنی ٹکڑے ملے ہیں اور زندگی بھر اس کی گذر اوقات انہی سونے کے ٹکڑوں پر ہوتی ہے۔ گذشتہ سال میں نے اور مول چند شاہ نے باہمی اشتراک سے ایک بڑے ایکسپیڈیشن کا پروگرام بنایا جو بلدان دریا کے منبع تک کھوج کریگا۔ مگر اس سوفورال کی اتفاقیہ ملاقات سے ہمارا پروگرام ٹھپ ہو گیا۔ اس سال ہم نے پھر پروگرام بنایا ہے اور مول چند شاہ ہفتے دس روز میں آنے والا ہے، اس موقع پر ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔"

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔ ؟" بلونت سنگھ نے سونے کا ٹکڑا ہنری کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

"تم بھی ریٹائرڈ آدمی ہو، میں بھی ریٹائرڈ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ تم اپنے وقت کے مشہور اور ماہر جیالوجسٹ رہے ہو۔ تم زمین کے اندر کا حال اس طرح پڑھ سکتے ہو جس طرح میں صبح کا اخبار پڑھ لیتا ہوں۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم نے گیگر کاؤنٹر (Geiger count) کی طرح کا ایسا آلہ بنایا ہے جو زمین کے اندر کی چھپی مختلف دھاتوں اور خصوصاً سونے کی تلاش میں ہمارا بے حد مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔ ؟"

ہاں سچ تو ہے مگر ابھی میں نے اس آلے کو پیٹنٹ نہیں کرایا ہے۔"

اچھا کیا ہے تم نے۔ پہلے ہم یہ سونے کی کان دریافت کر لیں پھر اس

آلے کو پیٹنٹ کراتے رہنا۔ تم اور میں اسکول میں ہم جماعت رہے ہیں۔ تم نے بھی شیب کاٹن اسکول میں تعلیم پائی ہے، میں نے بھی۔ ہم دونوں کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔"

"میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔" بلونت نے کہا۔

"لیکن میرا حصہ کیا ہوگا۔"

ہنری سونے کے پترے کو سیف میں بند کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں اب پانچ سو کی پنشن ملتی ہے۔ ظاہر ہے اس میں گذر تو کسی طرح ہوسکتی ہے۔ مگر اللّے تللّے سے نہیں۔ تمہارا عورتوں کا شوق اس میں سے کسی طرح پورا نہیں ہوسکتا۔ عورتیں سونے کو دیمک کی طرح چاٹتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر میں تم کو کان کی دریافت کے بعد ہر ماہ تین ہزار روپے دیتا رہوں۔"

"تین ہزار روپے نہیں، میں تیسرا حصہ لوں گا۔ تین کے برابر حصے ہوں گے ایک تمہارا، دوسرا میرا، تیسرا تمہارا مول چند شاہ تمہارے دوست کا جو تمہارے حساب سے ہفتے دس روز میں تمہارے پاس آنے والا ہے۔"

"یہ تو بہت ہے۔" میجر ٹاپس ورتھ نے کہا۔

"زیادہ نہیں ہے کم ہے۔" بلونت سنگھ بولا۔

"اور تمہارے ساتھی تو صرف راستہ بتائیں گے اور سفر کے اخراجات کے متحمل ہوں گے۔ اصل کام تو مجھے کرنا ہوگا۔ کان کی دریافت اس آلے کے بغیر ناممکن ہے۔"

اتنا کہہ کر بلونت سنگھ نے اپنے اندر کی جیب سے چھ انچ کا لمبا ایک آلہ

بھلا جس کے مرکز میں کانچ لگا ہوا تھا۔ اور کانچ کے اندر ایک سوئی کبھی دھیرے کبھی تیزی سے حرکت کرتی تھی۔ اور ایک طرف مختلف اعداد و شمار درج تھے۔ جن پر تین گھنڈیاں لگی تھیں۔ ان گھنڈیوں کو مختلف اعداد و شمار پر گھمانے سے سوئی کسی ایک نمبر پر آکے ٹھہر جاتی تھی اور دھیرے دھیرے ہلتی رہتی تھی۔ یہ اعداد ایک محراب کی شکل میں چھ انچ کی لمبی لکیر پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس لکیر کے نیچے قطب نما کی صورت میں کانچ کا ایک اور گول دائرہ بنا ہوا تھا۔ جس کے اندر دوسری سوئی برابر تھرتھرا رہی تھی۔

"یہ ہے میرا آلہ۔" بلونت سنگھ نے اس چھ انچ کے لمبے آلے کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو قطب نما تم دیکھتے ہو، یہ اسی سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جدھر کسی خاص دھات کی کان واقع ہے۔ مگر اس سمت کو معلوم کرنے کے لئے مجھے پہلے ان تین گھنڈیوں کو ایک خاص حساب سے گھمانا پڑتا ہے۔ اور ہر دھات کا عدد الگ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں تمہارے اس لوہے کے سیف کو لیتا ہوں۔ لوہے کا عدد سات بٹا نو د $\frac{7}{9}$ ، ہے۔ اس لئے جب ان گھنڈیوں کو گھمانے سے $\frac{7}{9}$ کا عدد حاصل ہوگا۔ تب یہ قطب نما کی سوئی تمہارے سیف کی طرف گھوم جائے گی۔"

بلونت سنگھ دائیں طرف کی گھنڈیوں کو گھماتے ہوئے $\frac{7}{9}$ پر لایا۔ تو ہنری نے دیکھا کہ قطب نما کی سوئی سیدھے لوہے کے سیف کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

"تو سونے کا ڈھیر دیکھا ہوگا۔؟" ہنری نے بلونت سے پوچھا۔

"یہ تمہیں کیوں بتاؤں۔ یہ راز میرے پاس محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس راز کی حفاظت ہی سے سونے کی کان میں میرے حصے کی حفاظت ہو سکتی ہے ——— ہے نا۔؟"

"منظور۔! ہاتھ ملاؤ۔" ہنری نا پس ورتھ نے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا۔

بلونت سنگھ سائنسداں نے اپنے نازک گلیجے ہاتھ میں میجر کی طاقت کو محسوس کیا مگر خاموش رہا۔ اس کے پاس سائنس کی طاقت تھی اور اب میجر کو اسے اپنے برابر کا حصہ دینا پڑیگا۔

اگر کسی طرح سے میجر اس کا آلہ چوری بھی کرلے تو بھی وہ اس کا استعمال نہ جانتے ہوئے اس آلے کو کسی طرح استعمال نہیں کرسکتا اور اسے ہر حال میں بلونت سنگھ سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔

میجر سونے کے پتھرے کو سیف میں بند کرکے اندر لے گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک نوکر چائے اور بسکٹ لے کے آگیا۔ میجر اور بلونت سنگھ دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

برآمدے کے قریب نیلا دھاری کی گہری گھنی باڑھ کے پیچھے چھپے ہوئے دلیپ اور کمل ساری باتیں سن رہے تھے۔ دلیپ نے نیلی دھاری کی قمیص اور سلیٹی رنگ کی شلوار پہن رکھی تھی۔ اور تیتوں کا ایک میلا کچیلا کوٹ، کمل نے کشمیری عورتوں کا فرن پہن رکھا تھا۔ اور کانوں میں بڑے بڑے جھالے دار آویزے۔

دلیپ نے کمل کو اشارہ کیا۔ کمل نے ایک کانگڑی اور چند پوٹلیاں، اٹھائیں، کچھ بغل میں دابیں کچھ سر پہ۔ دلیپ نے ایک بڑا ٹرنک اپنے سر پر اٹھایا اور دونوں گھسنی باڑھ کے عقب سے ہوتے ہوئے بنگلے کے باغیچے کے اس گیٹ پر نمودار ہوئے جہاں سے برآمدے میں بیٹھے ہوئے میجر ٹامپسن ورتھ اور ملونت سنگھ دونوں چائے پیتے نظر آرہے تھے۔

دلیپ نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا۔ اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے کمل بھی آگئی۔

"جاؤ۔ جاؤ۔" میجر بڑی سختی سے بولا۔

"ہمیں کچھ خریدنا نہیں ہے۔"

دلیپ بولا۔

"ہمیں کچھ بیچنا نہیں ہے سرکار۔ ہم کو رات گذارنے کے لئے آپ کے نوکر خانے میں تھوڑی سی جگہ چاہیئے۔"

میجر نے مغربی آسمان کی جانب دیکھا۔ بادل چاروں طرف سے گھر آئے تھے۔ کہیں کہیں بجلی چمک رہی تھی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میجر نے ان دونوں پر نگاہ ڈالی اور وہ دونوں بڑے مسکین سے بن گئے۔

میجر نے پوچھا۔

"کون ہو تم۔؟"

"حضور ہیں موضع اسمارا کا بچارا ری اور یہ میری عورت ہے۔ چرا س کی رہنے والی ہے۔ میں اس کو چراس سے، اس کے میکے سے لے کر

آرہا ہوں۔ یہ پیٹ سے ہے۔ بارہ میل پیدل چلی ہے۔ اب تھک گئی ہے۔ رات بھر کے لئے تھوڑی سی جگہ چاہیئے سونے کے لئے۔"

میجر کو ترس آگیا۔ اس نے اپنے نوکر بلایا۔

"لمہا مس ان دونوں کے لئے نوکر خانے کا ایک کمرہ کھول دو۔ اور رات کو کھانا بھی دیدینا۔ یہ عورت پیٹ سے ہے۔ اس لئے اس کو شراب پی کر چھیڑنا نہیں۔ سمجھ گئے۔"

"یس سر۔!"

جب لمہا مس چلا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے دلیپ اور کمل بھی چلے گئے۔

تو بلونت مسکرانے لگا۔ میجر قہقہہ مار کر ہنسا۔

"یارا۔ لمہا مس کا شوق بھی دیکھنا ہے جو ہمارا ہے۔"

٭ ٭ ٭

شام گہری ہوتی جارہی تھی۔ گرج اور چمک کے ساتھ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔

"موسم خوشگوار ہو چلا ہے۔ دلیپ نے نوکر خانے کی کوٹھری میں کمل سے کہا۔

"کس حساب سے یہ موسم خوشگوار ہے۔" کمل نے منہ بنا کر اس سے پوچھا۔

"آجکل چاندنی راتیں ہیں نا۔ چاندنی راتوں میں چوری کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ بادل اور بارش سے تاریکی بڑھ جائے گی۔ میجر شراب پی کر مزے سے سو جائیگا۔ سیف چرانے میں آسانی ہوگی۔" دلیپ نے کمل کو سمجھایا۔

کمل نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں۔ ! یہ تو ٹھیک ہے۔"

دلیپ نے خوشگوار موڈ میں ہوتے ہوئے کہا۔

"آج کی رات یہ پتا مل جائیگا تو بس پھر ایک پترا باقی رہ جائیگا۔ بس ہم اور ہماری سونے کی کان۔"

خوشی سے دلیپ اور کمل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

جب بوندا باندی تیز بارش میں بدلنے لگی تو میجر نے بلونت سے کہا۔

"آؤ اندر چلیں۔"

بلونت اٹھنے لگا۔ عین اسی وقت میجر نے دیکھا کہ بارش میں بھیگا ہوا تار ڈاکیہ سائیکل سے اتر کر باغیچے کے اندر آکر برآمدے کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔

برآمدے میں پہونچ کر ڈاکیے نے میجر کو سلام کیا اور ایک تار اس کے ہاتھ میں تھما کر دوسرا سلام کیا۔

میجر نے جلدی سے تار لے کر رسید کے کاغذ پر دستخط کئے اور تار کھول کر پڑھا۔ تار مولچند شاہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔

"سونے کا تیرا چوری ہو گیا۔ سٹاپ۔ ایک نوجوان لڑکی ایک نوجوان لڑکا۔ سٹاپ۔ دونوں پر نگاہ رکھو۔ سٹاپ۔ مفصل خط بھیجتا ہوں۔

مون چند شاہ"

تار پڑھ کر میجر نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر تار والے ڈاکیہ کو دیا۔ ڈاکیہ حیران ہو گیا۔ بلونت بھی حیرت میں رہ گیا۔

جب ڈاکیہ جھک کر سلام کرنے کے بعد چلا گیا تو بلونت نے پوچھا۔

"کوئی اتنی اچھی خبر ہے کہ ڈاکیہ کو پانچ روپے انعام دیا جائے۔"

"سو روپے انعام والی خبر ہے۔"

"کیا۔؟"

"اندر چلو تو بتاتا ہوں۔"

⁂ ⁂ ⁂

ٹھاکر مس نے دونوں کو کھانا کھلا دیا تھا۔ کھانا کھانے کے دو گھنٹے کے بعد بارش یکایک بہت تیز ہو گئی۔ جھکڑ، گرج اور چمک دل کو ہلائے دیتی تھی پورے یوس مرگ میں طوفان گھوم رہا تھا۔

کمل اور دلیپ دونوں جاگ رہے تھے۔

دلیپ نے گھڑی دیکھی۔ پھر اٹھ کر اپنے کپڑے بدلے۔ اس نے ایک نیکر پہن لیا۔ اور ایک بنیان اور سیف کھولنے کا سامان چمڑے کے ایک تھیلے میں ڈال کر کمل سے بولا۔

"میں میجر صاحب کا سونے کا پترا لیکر آتا ہوں۔ تم دروازہ بند کر کے بیٹھو۔ جب میں واپس آؤں گا تو پانچ بار دروازہ کھٹ کھٹاؤں گا۔ تین بار زور سے دو بار ہلکے سے۔ سمجھ گئیں۔ جب تک میں نہ آؤں دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھی رہنا۔ سوامی جانا کیونکہ ہم یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہریں گے۔ سونے کا پترا حاصل کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔ آخری پترے کی تلاش میں۔"

"او۔ کے۔!" کمل ہاتھ ہلا کے بولی۔

دلیپ دروازے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔!

دلیپ چونک کر بولا۔

"کون ہے۔؟"

باہر سے طہاسں کی آواز آئی۔

"میں ہوں طہاسں، قہوہ لایا ہوں۔"

دلیپ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی طہاسں پیچھے ہٹ گیا اور میجر آگے آگیا۔ اب دلیپ، میجر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نال دیکھ رہا تھا۔

میجر اور طہاسں دونوں نے مل کر دلیپ اور کمل کو باندھ کر آس پاس لگی

چارپائیوں پر ڈال دیا۔ ان کی اچھی طرح سے تلاشی لی اور جب تلاشی لینے کے بعد میجر نے سونے کے سارے تیرے برآمد کر لئے اور انہیں اپنی جیب میں ڈال لیا تو وہ ذرا سا مؤدبانہ جھکا اور بولا۔

"شکریہ، بہت بہت شکریہ دوستو۔ آپ لوگ عین موقع پر آئے۔ آپ کی مدد کا بیحد شکریہ۔ میں اس دروازے کو باہر سے قفل لگا کے جاتا ہوں۔ دو روز تک یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ دو دن تک ٹھامس آپ کی باقاعدہ دیکھ بھال کرتا رہے گا۔ ٹھامس، پیٹر، اور میرا مالی غیاث تینوں ملکر میرے حکم کے مطابق آپ کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ مگر ہماری واپسی تک آپ دونوں اس کمرے سے باہر نہیں جاسکیں گے۔"

پھر دروازہ بند ہوگیا۔ اور باہر سے قفل لگانے کی آواز آئی پھر تڑاتڑ بارش کے برسنے کی آواز دیر تک آتی رہی۔ دلیپ اور کمل دونوں بندھے بندھے ناامیدی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اتنے مہینوں کی محنت بیکار گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

میجر نے بلونت سنگھ کو سوتے سے جگایا بولا۔

"ابھی چلنا ہوگا۔"

"اس طوفان میں۔ !" بلونت نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کس طرح۔؟"

"باہر میری جیپ کھڑی ہے۔ اس کی ٹنکی پٹرول سے بھری ہے۔"

"جیپ کہاں تک جائے گی۔؟"

"جہاں تک جائے گی لے جائیں گے۔ پھر جیپ چھوڑ کر پیدل سفر کریں گے۔"

"صبح تک انتظار کیوں نہ کریں۔"

"کس کا انتظار۔؟"

"تمہارا وہ بمبئی کا دوست مولچند شاہ بھی تو آنے والا ہے۔"

میجر بولا۔ "اب مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ ایک کے سوا کان کے نقشے کے سارے پترے میرے پاس ہیں۔ تمہارے آنے کی مدد سے اور اس نقشے کی مدد سے کان کو ڈھونڈھ نکالنا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ میں مولچند کو ایک تہائی حصہ کس لئے دوں۔؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" بلونت سنگھ بستر سے اٹھ کر کپڑے بدلتے ہوئے بولا۔

٭ ٭ ٭

کسمسانے کی کوشش کرنے کے بعد یکایک کمل کو اوپر کے ایک پائے

میں سے ایک آہنی کیل باہر نکلی ہوئی نظر آئی۔ کمل نے اپنے کندھے کو باندھنے والی رسی کو اس کیل سے الجھا لیا۔

کمل کو بار بار ہلتے جلتے دیکھ کر دلیپ نے پوچھا۔

"کیا کر رہی ہو۔؟"

کمل بولی۔

"ایک کیل ہے۔"

دلیپ سب سمجھ گیا۔

"تب تو سمجھو کام بن گیا۔"

گھسیٹتے گھسیٹتے دو گھنٹوں میں کیل کی مدد سے کمل نے اپنے کندھے سے بندھی رسی کو توڑ ڈالا اور بائیں بازو کو آزاد کر لیا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں وہ رسیاں تڑا کر دلیپ کے سرہانے کھڑی تھی۔ اور اس کی رسی کی مضبوط گانٹھیں کھول رہی تھی۔ ساتھ میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"میجر کو کیسے پتہ چل گیا۔؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ورنہ میں ہوشیار رہتا۔"

"ارے۔۔؟"

یکایک دلیپ چونکا۔

نو کر خانے کے قریب سے کسی انجن کے اسٹارٹ ہونے پر کسی کار یا گاڑی یا جیپ کے تیزی سے گھوم جانے کی آواز آئی۔

"وہ لوگ گئے۔" دلیپ چارپائی سے اٹھ کر بولا۔

"اس طوفان میں۔"

"میجر نے نقشہ حاصل کرنے کے بعد یہاں ایک لمحہ گنوانا مناسب نہ سمجھا اور نہ میں سمجھتا ہوں۔"

"مگر ہم نکلیں گے کیسے۔؟ دروازہ مضبوط ہے اور باہر سے تو قفل ہے۔"

دلیپ کمرے میں چاروں طرف گھوما۔ دروازے کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ پھر عقبی دیوار کی کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کھول کر دیکھا بڑی مضبوط آہنی سلاخیں تھیں۔

دلیپ نے چمڑے کی تھیلی سے بجلی کی ریتی نکالی۔ یہ ریتی بیٹری سے چلتی تھی۔ اس ریتی سے وہ سلاخیں کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ شکر ہے کہ اس وقت طوفان زوروں پر تھا ورنہ ریتی کے چلنے کی اور سلاخوں کے کٹنے کی آواز سے لوگ جاگ جاتے۔

تین سلاخیں کاٹنے کے بعد تھوڑا سا ضروری سامان لے کر دلیپ اور کمل کھڑکی کے راستے سے نکل گئے۔

باہر نکل کر سردی اور بارش سے کانپتی ہوئی کمل نے پوچھا۔

"اب ہم کدھر جائیں گے۔؟"

"جدھر جیپ گئی ہے۔ یہ نشان دیکھو۔"

"پیدل۔!"

"ہاں ــــ جب تک پیدل۔ جب تک کوئی دوسری سواری نہیں ملتی۔"

جیپ کے نشان شمال کی طرف جا رہے تھے۔ کوئی پون میل چلنے کے بعد ایک اور بنگلہ درختوں سے گھرا ہوا نظر آیا۔ بنگلے سے باہر ایک دو طرفہ کھلے خیمے میں ایک فورڈ اسٹیشن ویگن نظر آئی جس کے اندر ڈرائیور سو رہا تھا۔ دلیپ نے بند ویگن کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ ڈرائیور ٹارچ لئے ویگن سے نیچے اترا۔

"کون ہو تم۔؟" ڈرائیور غصہ سے چلایا۔

"ہم دونوں میاں بیوی اس طوفان میں کھو گئے ہیں۔ رات بسر کرنے کے لئے جگہ چاہیئے تھی۔"

ڈرائیور کو کامنی فگر میں ایک بیحد خوب صورت عورت نظر آئی چند لمحوں ہی میں اس نے بہت کچھ سوچ لیا۔ بولا۔

"اگر رات بسر کرنا ہے تو اس خیمے کے پیچھے بیٹھ سکتے ہیں۔ اگر سونا ہے تو ویگن کے اندر آجاؤ۔"

"سوئیں گے۔" کمل مسکرا کر بولی۔

ڈرائیور ویگن کا دروازہ کھولنے لگا۔ دلیپ نے ایک شاندار چاپ اس کی کمر میں دیا۔ دوسرا اس کی گردن میں اور ڈرائیور مڑتے مڑتے گر کر بیہوش ہو گیا۔ دلیپ نے اس کے جسم کو خیمے کے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ اور اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر گاڑی کی چابیاں نکالیں اور ایک چابی کو گھما کر انجن اسٹارٹ کیا۔

○

تیسرے پہر سے صبح تک بارش کی کیچڑ نے آگے جانے والی جیپ کی نشان وہی کی تھی۔ لگتا تھا۔ رات کے طوفان میں اس کے سوا اور کوئی دوسری گاڑی ادھر سے نہیں گزری ہے۔ تالموڈہ سے وہ چھ پان گئے اور چھ پان سے سرسہ، سرسے سے دو میل آگے جا کے جیپ بکایک ایک کچی پگڈنڈی پر اتر گئی تھی۔ یہاں پر جیپ کے ٹائروں کے نشان بہت گہرے ہو گئے تھے۔

یہ پگڈنڈی سے زیادہ ایک کچی سڑک سی تھی جس کے دو رویہ چیڑھ کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اور موڑ کاٹ کاٹ کر یہ سڑک دھیرے دھیرے بلند ہوتی جا رہی تھی، کوئی دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد ایک نشیبی راستہ سا ملا۔ یہ راستہ بہت اوبڑ کھابڑ تھا۔ مگر دلیپ بڑی مستعدی سے فورڈ ویگن چلاتا

رہا۔ اب جنگل کم ہو چلا تھا۔ اور گھاس اور چٹانیں اور جھاڑیاں نمودار ہو رہی تھیں جن کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں پچھلے سال کی برف تودے منجمد تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ اسی طرح چلنے کے بعد وہ پھر بلندی کی طرف گئے۔ پھر ایک خطرناک موڑ کاٹ کر یکایک دلیپ نے زور کی بریک لگائی۔ دیگن کا سارا جسم جھنجھنا گیا مگر دیگن رک گئی۔

سامنے راستہ میں ہیری کی جیپ کھڑی تھی مگر خالی تھی۔ دلیپ نے دیگن کے چاروں طرف چٹانوں کے اردگرد کئی چکر لگائے مگر ہیری کا کوئی سراغ نہ ملا۔

جہاں پر جیپ کھڑی تھی۔ وہاں پر راستہ یکایک ختم ہو گیا تھا۔ آگے ایک گہری کھائی دی۔ جس کے نشیب میں برف کے درمیان دیودار کے نوجوان پودے اگ رہے تھے۔ دلیپ کی نگاہیں نشیب کو کراس کر کے آگے ایک چھوٹی سی وادی میں پہونچیں۔ جس کی شمالی سمت سے ایک چھوٹا سا دریا بل کھاکر مغرب کی طرف ڈھل جاتا تھا۔ اور دریا کے کنارے کنارے ایک پتلی سی پگڈنڈی مشرقی سمت کو جاتی تھی۔ شمال مشرقی سمت میں جھاڑیوں سے بھرا ہوا اور کہیں کہیں بلند و بالا چٹانوں سے گھرا ہوا اور کہیں کہیں گہری کھائیوں میں برف کے تودوں کو اپنے سینے سے لگائے ایک اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔ اس کے دامن میں پہاڑ اور دریا کے بیچ پتلی وادی میں سے وہ پگڈنڈی گزرتی تھی۔

دلیپ نے ہوا کو زور سے سونگھا۔ وہ خاصی بلندی پر تھے اور

ان کے سامنے وادی والا پہاڑ ان سے بھی بلندی پر تھا۔ جہاں پر ولیپ کھڑا تھا۔ وہاں سے وہ نیچے جاتے ہوئے نشیب کی برف میں دو آدمیوں کے قدموں کے نشان دیکھ سکتا تھا۔ یہ نشان نشیب سے اتر کر نیچے وادی میں گم ہو جاتے تھے۔

"وہ ادھر گئے ہیں۔"

کمل نے نیچے نشیب کے قدموں کے نشان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں۔" ولیپ بولا۔

"نیچے وادی میں جا کر ٹھیک سے معلوم ہوگا۔ وہ کدھر گئے ہیں۔"

"ممکن ہے دریا پار کر گئے ہوں۔"

"وہ تو نیچے وادی میں جا کر معلوم ہوگا۔"

سری نگر ہی سے وہ دونوں سفر کی تیاری کر کے آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سونے کا آخری بڑا سہارا گاؤں کے ایک آدمی کے پاس ہے۔ اس لئے وہ ادھر آنے کے بالکل تیار ہو کر آئے تھے۔ ولیپ نے خاکی کارڈرائے کی برجیس پہن رکھی تھی۔ اور اسی رنگ کی جودھپور کمل نے پہن رکھی تھی۔ بوٹ ایسے تھے جن کے اندر پانی نہیں جا سکتا تھا۔ نہ برف۔ گرم جرابیں۔ گرم دستانے اور اندر روئی لگی جیکٹ بھی دونوں نے پہن رکھی تھی۔ اور سر پر گہری اُون والے کنٹوپ۔ وہ ہر طرح سے تیار ہو کر سردی اور برف کا مقابلہ کرنے آئے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم

تھا کہ اسمار اگاؤں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

گرم کپڑے جو وہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ بہت کم سامان انہوں نے اپنے ساتھ لیا۔ دو چھوٹی چھوٹی کدالی اور نائلان کی رسیاں۔ کھانے کا مختصر سامان اور بس وہ دونوں فورڈ ویگن کو جیپ کے عقب میں چھوڑ کر نشیب کی برف میں اتر گئے۔

نیچے وادی میں جاکر بھی انہیں کوئی بشر نہ ملا۔ دلیپ نے انتہائی غور سے پگڈنڈی پر چلنے والے قدموں کے نشان کا مطالعہ کیا۔ عرصے سے کوئی انڈی پر نہیں چلا تھا۔ صرف دو آدمیوں کے قدموں کے نشان تھے۔ جو دریا کے کنارے کنارے دور تک مشرقی سمت کو چلے جا رہے تھے۔

"وہ بھی ادھر ہی گئے ہیں۔" کمل بولی۔

"ہمیں انہیں راستہ ہی میں پکڑنا ہوگا۔"

کمل کچھ نہیں بولی۔ نشان کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد بولی۔

"لگتا ہے بہت تیز رفتار ہیں۔ بلکہ میجر دوسرے آدمی سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ ایک آدمی آگے جا رہا ہے۔ دوسرا اس سے کچھ اور پیچھے مگر دونوں ایک سمت کو جا رہے ہیں۔"

دلیپ نے غور کرنے کے بعد کہا۔ "ہم یہ راستہ چھوڑ دینگے اور اس اونچے پہاڑ پر چڑھیں گے۔"

"ایسا کیوں۔؟" کمل بولی۔

"ہم دوڑ کر ان کو پکڑ سکتے ہیں۔"

"نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ہم سے کئی گھنٹے آگے ہیں۔" ویب بولا۔
"اب ایک ہی ترکیب ہے۔ ہم اس پہاڑ پر چڑھ کر اس پگڈنڈی کو نظر میں رکھتے ہوئے کوئی شارٹ کٹ ڈھونڈیں۔ اور ان کے آگے پہنچ جائیں اور وہاں پر ان کا انتظار کریں جہاں پر انہیں کوئی سان و گمان تک نہ ہو۔"

"وہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟" کمل مسکرا کر بولی۔

"میجر سمجھ رہا ہوگا۔ ہم دونوں ابھی تک اس کے نوکر خانے میں بند ہیں۔"

"پھر بھی ہماری طرف سے ہر طرح کی پیش بندی لازم ہے۔"

❊ ❊ ❊

وہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے، خاردار جھاڑیوں میں سے گزرتے۔ ننگی سنگلاخ چٹانوں میں سے گزرتے۔ سخت اور منجمد برف کی سطح کو کدالوں سے کھود کر قدم جما کر چلتے، نیچے گزرنے والے راستے پہ نگاہ رکھتے بڑھتے گئے۔ نیچے کا راستہ لمبا تھا۔ اور ان کا پہاڑی راستہ چھوٹا۔ اس لئے کوئی دو تین گھنٹے کی چڑھائی کے بعد وہ جب نشیب

کی طرف روانہ ہوئے تو چھدرے چھدرے کوتاہ قد دیواروں کی آڑ سے انہوں نے نیچے جو نگاہ ڈالی تو میجر ٹاپس ورتھ اور بلونت سنگھ جیالوجسٹ کو تنگ پگڈنڈی پر گھوڑے کی ڈلکی چال کی طرح چلتے دیکھا۔

کچھ دیر وہ دونوں دیو داروں کے پیچھے چھپے ان کو پگڈنڈی پر بڑھتے دیکھتے رہے۔ پھر کمل نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی۔ دائیں طرف ایک کلّہ کوہ نظر آیا۔ اس نے سوچا اگر ہم جلدی سے اس کلّہ کوہ کو پار کرلیں۔ تو بڑی آسانی سے ہم میجر ٹاپس ورتھ اور اس کے سائنسداں ساتھی سے آگے جا سکتے ہیں۔ عین اسی وقت یہی خیال دلیپ کو بھی آیا اور جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ایک کا خیال دوسرے کے خیال میں سما گیا۔ دونوں اکدم مسکرا اٹھے اور اٹھ کر کلّہ کوہ کی طرف بڑھ گئے۔

مگر یہ اونچائی اس قدر دشوار گزار تھی کہ اگر وہ اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے تو گھنٹوں صرف ہو جاتے اور ممکن یہ بھی تھا کہ کسی چٹان یا تودۂ برف کے گرنے سے نیچے چلتے ہوئے دشمن خبردار ہو جاتے۔ اس لئے ان دونوں نے اپنی پہلی تجویز کو رد کر دیا۔ اور کلّہ کوہ کے دامن سے نیم دائرے کی شکل میں راستہ بناتے ہوئے اس کے عقب میں گھوم گئے۔

دوسری طرف جو پہنچے تو نشیب راستہ کے اسقدر قریب تھا کہ پگڈنڈی اور ان کے درمیان چند گز ہی کا فاصلہ رہ جاتا تھا۔

اتفاق سے اس نشیب اور راستہ کے درمیان چند چٹانیں ابھری کھڑی تھیں۔ وہ دونوں ان چٹانوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ ایک ایسے زاویے

سے جہاں سے وہ دونوں نیچے پگڈنڈی پر آنے والے میجر اور سائنسداں کو دیکھ سکتے تھے۔

ابھی دونوں پگڈنڈی پر آنے والے ان دونوں سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھے۔

دلیپ ان دونوں کو نزدیک آتے دیکھ کر سرگوشی میں بولا۔

"کمل۔! تم سائنسداں کو سنبھالو۔ میں میجر یا پس ورتھ کو پکڑتا ہوں"

کمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ہاں میں سر ہلا دیا۔

اب نیچے سے آنے والے ان سے صرف چند گز کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اب وہ دونوں ان کے نیچے سے گزر رہے تھے۔

یکایک دلیپ اور کمل دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اسی ساعت میں اکٹھے نیچے جمپ مارا۔ کمل سائنسداں پر گرا اور دلیپ میجر پر۔

کمل نے بلونت سنگھ کو ایک پٹخنی دی اور پھر جب وہ اٹھ ہی رہا تھا تو اس زور سے لات اس کے پیٹ پر لگائی کہ بلونت سنگھ دوہرا ہو کر شدید درد سے کراہنے لگا۔ اتنے میں دونوں ہاتھوں سے کمل نے ایک چاپ اس کی گدی میں جمائی تو بیچارہ سائنسداں جس نے زندگی بھر کسی جسمانی لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا وہیں پگڈنڈی پر بیہوش ہو کر ڈھیر ہو گیا۔

پھر کمل نے پلٹ کر میجر اور دلیپ کی طرف دیکھا۔

میجر بھی بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ فوج کا تربیت یافتہ کسرتی بدن

برابر دلیپ کا مقابلہ کر رہا تھا۔ کبھی میجر نیچے کبھی دلیپ اوپر۔

چند منٹ کمل خاموشی سے اس لڑائی کو چپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جیب سے ایک پستول نکالا اور اٹھا کر میجر کی پیٹھ پر فائر کر دیا۔ فائر ہوتے ہی میجر بے اختیار اچھلا، پھر ایکدم گر کر ڈھیر ہو گیا۔

"یہ کیا کیا تم نے۔؟" دلیپ نے کمل سے کہا۔

اس کے لہجہ میں غصہ تھا۔

"میں اسے دھیرے دھیرے تھکا کر زیر کر لیتا۔ تم نے اسے جان سے مار دیا۔ میں کسی کو بھی جان سے مار دینے کے خلاف ہوں۔"

کمل نے مسکرا کر کہا۔

"میں خود بھی کسی کو جان سے مار دینے کے خلاف ہوں۔ میں نے میجر کو مارا نہیں ہے۔ میجر صرف بیہوش ہوا ہے۔ یہ پستول دیکھ لو۔ دلیپ جرمنی کا نیا ہتھیار ہے۔ اس میں ربڑ کا کارتوس بھرا جاتا ہے۔ یہ کارتوس مارتا نہیں، زخمی نہیں کرتا۔ صرف بیہوش کرتا ہے۔"

دلیپ نے میجر کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔

واقعی میجر کو کہیں چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ فقط بیہوش ہوا تھا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں کمل کو داد دی۔ میجر کی تلاشی لے کر نقشے کے ٹکڑوں کو برآمد کیا۔ پھر میجر اور سائنسداں کو رسیوں سے باندھ کر ان کو گھسیٹ کر ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔

دلیپ بولا۔

"کوئی چرواہا ادھر سے گزرے گا، آج یا کل تو انہیں آزاد کر دیگا۔
جب تک ہم بہت آگے جا چکے ہوں گے۔"

کمل پگڈنڈی پر آگے جا چکی تھی۔ پلٹ کر بولی۔

"آؤ چلیں۔ شام سے پہلے ہمیں اسمارا پہونچ جانا چاہیئے۔

بلدان دریا کے کنارے پگ ڈنڈی کو پکڑ کر چلتے ہوئے:
ایک خوشنما چراگاہ میں پہونچ گئے۔ یہاں دریا کا پاٹ پھیل گیا تھا۔ اس کی پُرشور روانی ختم گئی تھی۔ یہاں گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ دریا کے دوسری طرف ذرا بلندی پر ایک پھیلی ہوئی ڈھکی پر ملوٹ کا گاؤں آباد تھا۔ یہاں مکئی اور چاول کی فصل ہوتی ہے۔ اور مویشی چرانے کے لئے عمدہ چراگاہیں بھی ہیں۔ ایسی کئی چراگاہیں سرسبز و شاداب وہ راستہ میں چھوڑ آئے تھے۔

چرواہوں سے اسمارا گاؤں کا پتہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہیں یہاں سے دریا پار کر کے ملوٹ گاؤں کے اوپر کی ڈھکی سے ہو کر میاں میر کی ڈھوک سے گزر کر اور اوپر جانا ہوگا۔ اسمارا گاؤں کوئی نو، دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہاں صرف بکروال لوگ رہتے ہیں۔ وہ بھی گرمیوں کے موسم میں۔ سردیوں

یں نیچے اتر آتے ہیں۔

اسمارا گاؤں کا پتہ اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد کمل نے ایک چرواہے سے پوچھا۔

"تمہارے ملوٹ میں کتنے سونو رالی ہیں۔"

چرواہا بولا۔

"ایک ہی خاندان تھا۔ اب تو اس میں سے کوئی نہیں بچا۔ ایک بڈھا تھا وہ بھی چل بسا۔"

"دوسرے لوگ یہ پیشہ کیوں نہیں اختیار کرتے؟" کمل نے پوچھا۔

"دن بھر دریا کی ریت چھان چھان کر دو چار روپے کا سونا نکالنے سے مویشی پالنے کا دھندا زیادہ اچھا ہے۔" چرواہے نے جواب دیا۔

دلیپ نے پوچھا۔

"تم لوگ دریا پار کے ادھر کی چراگاہ میں کتنے دن رہو گے۔؟"

"بس آج کی رات۔ کل یوس مرگ کو روانہ ہو جائیں گے۔"

دلیپ کے دل کو تسلی ہو گئی۔ کل آدھے راستہ کی مسافت میں انہیں میجر اور وہ سائنسداں ڈھونڈتے ہوئے مل جائیں گے اور اس طرح ان دونوں کو آزادی مل جائے گی۔

ملوٹ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رکے۔ چرواہوں کے بتائے ہوئے راستہ پر ڈھکی پر ڈھکی چڑھ کر میاں میر کی ڈھوک سے گزر کر اسمارا گاؤں پہنچے اور ایک بکروال سے دلیپ نے دریافت کیا۔

"اسحاق نام کا کوئی آدمی اس گاؤں میں رہتا ہے۔؟"

"وہ تو کئی برس ہوئے یہاں سے چلا گیا۔"

یکایک دلیپ کا دل بیٹھ گیا۔

پھر اس نے سوال کیا۔

"کدھر گیا۔؟"

بکروال نے اپنے سر کے اوپر کے اونچے اور پھیلے ہوئے درّے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کئی سال ہوئے ایک بکروال نے اسے اس چوٹی کے اوپر سے گزرتے دیکھا تھا۔ پھر اسحاق کبھی ادھر واپس نہیں آیا۔"

دلیپ اور کمل دونوں اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔ چوٹی درمیان میں سے پھٹی تھی۔ اور ایک درہ سا بن گئی تھی۔ درّے پر ادھر درّے کے دونوں طرف برف چمک رہی تھی۔

"تو اسحاق آجکل کدھر رہتا ہے۔؟"

"ہم کو نہیں مالوم۔" وہ بکروال بولا۔

"کدھر گیا کیا معلوم۔؟"

بکروال انہیں چھوڑ کر اپنا ریوڑ سنبھالنے میں مصروف ہو گیا۔

دلیپ نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ کمل کی طرف دیکھا۔ پوچھا۔

"تھک تو نہیں گئی ہو۔؟"

"بس اتنا ہی تھکی ہوں جتنا تم تھکے ہو گے۔"

دلیپ ہنسنے لگا۔ بولا۔

" میرا ارادہ آج چاند نکلنے سے پہلے اس درّے کو پار کر جانے کا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ؟"

" ٹھیک ہے۔ ہمارے اور میجر کے درمیان جتنا فاصلہ زیادہ ہوتا جائے ٹھیک ہے۔ میں ساری رات چل سکتی ہوں۔"

⁂ ⁂ ⁂

کوئی آٹھ بجے کے قریب مغرب میں آدھا چاند نکلا۔ اس وقت وہ درے سے گزر رہے تھے۔ یکایک چاندنی پھیلتے ہی ٹھٹھک سے گئے۔ چاندنی کے سحر آمیز نور نے برف کو سیماب میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہر شے نور میں نہا کر دھندلا گئی تھی۔ اب وہ درّے کے دوسری طرف دیکھ سکتے تھے۔ نیچے کوئی پانچ ہزار فٹ کی سنگلاخی چٹانوں کی ڈھلوانوں کے بعد انہیں ایک چھوٹی سی ڈھوک نظر آرہی تھی۔ جس کے کنارے پتھروں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا گھر دکھائی دے رہا تھا۔ اس گھر سے لگا ہوا تنگ کا ایک بڑا درخت تھا۔ جس کی چوٹی پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کھلے دروازے سے روشنی کی چمک بار بار جھلک جاتی۔

شائد گھر کے اندر چولہا جل رہا تھا۔

دلیپ اور کمل کی بھوک تیز ہو گئی۔

دلیپ نے کہا۔

" اس درے پر ٹھہرنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ اس نیچے والے گھر میں پناہ لیں گے۔"

کمل نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

" کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں پہونچ جائیں گے۔ اس آگ کو اتنی دور سے دیکھ کر کتنے آرام کا احساس ہوتا ہے۔ جب سے یوس مرگ سے چلے ہیں ایک لمحہ کا چین نہیں ملا۔ میرے تو انگ میں تھکن رچ گئی ہے۔"

دھیرے دھیرے وہ اس چھیلی ہوئی چاندنی میں اس گھر کی طرف جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔

کوئی دو گھنٹے کی خطرناک اُترائی کے بعد جب وہ اس سرسبز ڈھوک میں پہونچے تو انہیں چٹانوں اور پتھروں سے مل کر بنا ہوا وہ چھوٹا سا گھر نظر آیا۔ جس کے قریب تنگ کا گھیرے دار درخت تھا۔ جس پر ہوا میں ایک سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔

گھر کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ چراغ کی روشنی میں انہیں ایک آدمی بلند آواز میں ایک کتاب پڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ ایک سبز تہمد باندھے ہوئے ایک کالے کمبل کو اپنے اوپر کے حصے پر اوڑھے ہوئے پتھر کے طاق میں رکھے چراغ کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔

"اے تقاضائے دو چشم دل شناس
کو ہمی جو ید ضیائے بے قیاس

(یہ تقاضا ہے کہ چشم دل شناس
ڈھونڈتی ہے اک ضیائے بے قیاس)
چوں فراقِ آں دو نورِ بے ثبات
تا سر آور دست کشادی چشمہات
(جیسے فانی روشنی کی آرزو
کھولتی ہے تیری آنکھیں جو بجو)
بس فراق آں دو نورِ پائیدار
تا سہ می آرد مراں را پاس دار
(ایسے ہی دوری نورِ پائیدار
رکھتی ہے بے تاب تجھ کو اے نگاہ)"

یکایک اس آدمی نے جس کے چہرے کا رنگ سانولا تھا۔۔۔۔۔۔ اور سر کے اور داڑھی کے بال کھچڑی تھے، دروازے پر کھڑے دو سایوں کو دیکھ کر کتاب بند کر دی۔ اُسے بند کر کے چوما اور ایک طرف چٹان پر رکھ دیا اور طاق سے دیا اٹھا کر ان دونوں سایوں کی طرف لے جا کر بولا۔

"کون لوگ ہو تم۔؟"

"پردیسی ہیں۔ رات کے لئے پناہ چاہتے ہیں۔" دلیپ بولا۔

"تو اندر آجاؤ۔ باہر سردی میں کیوں ٹھٹھر رہے ہو۔"

دلیپ اور کمل دونوں کانپتے ہوئے گھر کے اندر آگئے۔

دلیپ نے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔ ادھر ادھر کھا ہُد

چٹانوں اور پتھروں کو ایک دوسرے پر ٹکا کر ایک چھوٹی سی چار دیواری بنائی گئی تھی۔ ایک کونے میں چولہا تھا۔ چولہے کے قریب مٹی کا گھڑا تھا۔ اس کے قریب لکڑیوں کا ایک کھلا گٹھا۔ ایک کونے میں طاق۔ طاق میں دیا۔ طاق کے نیچے پتھروں ہی سے بنی ہوئی ایک اونچی جگہ پر بیٹھ کر یہ آدمی کتاب پڑھ رہا تھا۔

دلیپ نے دیکھا کہ جب وہ آدمی اپنا کمبل چھوڑ کر ان کے قریب آیا تو اس نے کمبل کے نیچے ایک پھٹی بنڈی پہن رکھی تھی۔ مگر اس آدمی کی نگاہوں میں گہرا سکون تھا۔ اور اس کی گہری آواز میں ایک ایسی ریشمی مٹھاس جو کہیں کہیں دل کے اندر شانتی اور امن کی گھنٹیاں بجانے لگتی تھی۔

کمل ایک کونے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پاؤں پسار کے اور بے حد تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

"بابا — تمہارے گھر میں کچھ کھانے کو ہوگا۔ ؟ بہت بھوک لگی ہے۔"

وہ آدمی ذرا سا مسکرایا۔ اور مسکراتے ہی ایک عجیب سا نور اس کے سارے چہرے پر پھیل گیا بولا۔

"بابا کے گھر میں کیا نہیں ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ کمل کو ایک خوشگوار خواب کی طرح نظر آیا۔ وہ آدھی سو رہی تھی۔ آدھی جاگ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس آدمی نے چولہا سلگایا۔ پھر اسے خوب اچھی طرح سے روشن کیا۔ لکڑی کی ایک پرات میں قریب پڑے لکڑی کے ایک ڈول سے مکئی کا آٹا نکال کر

اسے گوندھا اور توے پر روٹی نیم پخت کر کے اُسے آگ میں کُرکُری کرتا رہا۔ پھر وہ یکایک باہر چلا گیا۔ کمرے میں آگ کی میٹھی گرمی اور مکئی کی روٹی کی سوندھی خوشبو پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آدمی واپس اندر آیا تو اس کے ہاتھ میں ہرے ہرے پتوں والے خوشے تھے۔ جن سے جنگلی پودینے کی خوشبو آرہی تھی۔ اس آدمی نے پودینے کی چٹنی ایک چھوٹی سی سل پر تیار کی۔ اس میں انار دانہ اور نمک اور لال مرچ ڈال کے اسے خوب خوب پیسا۔ کمرے میں کیسی سکون آمیز فضا چاروں طرف سے کمل کو چھو رہی تھی۔ معلوم نہیں کب اس نے جھپکی لی۔ پھر اسے معلوم ہوا جیسے وہ آدمی دھیرے سے اسے شانے سے جھنجوڑ کر جگا رہا ہے۔ اور اس کے سامنے ایک طباق رکھ رہا ہے۔ جس میں مکئی کی کئی روٹیاں رکھی تھیں۔ کمل نے دو روٹیاں اٹھالیں۔ ان پر پودینے کی چٹنی رکھ لی اور کھانے لگی اور بار بار اس چٹنی کی تعریف کرنے لگی۔ ایسی عمدہ اور مزے دار چٹنی اس نے زندگی میں کبھی نہیں کھائی تھی۔ سو طرح کے مغلئی اور فرانسیسی کھانے اس ایک چٹنی پر نثار تھے۔

شعلے کبھی اس کے سانولے چہرے پر چمک اٹھتے کبھی اس کی کھچڑی داڑھی پر۔ کبھی اس کے مسکراتے ہونٹوں پر۔ اب وہ دو کمبل زمین پر بچھا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھری ہوئی زمین پر۔ لیکن آج اگر کمل کو پتھر تو کیا لوہے کی کیلوں سے بھری زمین بھی ملتی تو وہ اس پر بھی سو سکتی تھی۔ آخری منظر جو اس نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ایک کونے میں دلیپ بھی تھک کر لیٹ گیا تھا۔ اور وہ آدمی ان دونوں پہ الگ الگ کمبل ڈال رہا تھا۔ پھر اس نے اس آدمی کو پتھروں سے

بنے ہوئے چبوترے پر اپنے لئے کمبل ڈال کر اسی کتاب کو کھول کر پڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر کمل کو کچھ یاد نہ رہا۔ اس کی نگاہیں نیم گرم نیم مدہوش فضا میں ڈوبتے ڈوبتے گہری غنودگی میں چلی گئیں۔

٭ ٭ ٭

جب وہ اٹھی تو صبح کی دھوپ دروازے سے اندر آ رہی تھی۔ باہر آسمان نیلا تھا۔ اور دروازے سے نظر آتی ہوئی ڈھوک کی زمین ہری ہری گھاس اور بیلوں سے سبزہ زار ہو رہی تھی۔ کمل ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ باہر ایک کسی ہوئی رسی پر دلیپ اپنا گیلا نیکر ڈال رہا تھا۔ اور بابا اپنا گیلا تہمد۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا ہوا اندر آیا۔ پھر اس نے چنگیر سے مکئی کی دو روٹیاں نکالیں اور ان کے چار ٹکڑے کئے۔ پھر ایک ڈبے سے جنگلی شہد نکال کر ان پر رکھا اور آدھی آدھی روٹی دلیپ اور کمل کو دے کر آدھی روٹی خود کھانے لگا۔

کمل بولی۔ "کیا مزے دار ناشتہ ہے۔"

"ہے نا۔؟" بابا خوش ہو کر بولا۔

"رات کی چٹنی بھی عمدہ تھی نا۔؟"

"بہت عمدہ تھی بابا۔" کمل بولی۔

پھر دلیپ اور بابا دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم دونوں کہاں سے آ رہے ہو۔؟ لگتا ہے نہا کے آئے ہو۔"

دلیپ کا چہرہ رات بھر کی نیند اور اس وقت کے غسل سے کھلا ہوا تھا۔
حسرت آمیز لہجہ میں بولا۔

"ڈھوک سے نیچے اتر کے ایسی ایک خوبصورت جھیل ہے کہ تم دیکھتی رہ جاؤ۔ پانی نیم گرم اور کہیں بھاپ دیتا ہوا گرم۔ اور جھیل کے چاروں طرف سنہری ریت اور کہیں کہیں ابھری ہوئی چٹانیں۔ پھر بہت دور جاکر دیوار، پہاڑ اور چیڑھ کے جنگل جنکے نوکیلے پتّے، ہوائیں سرسراتے ہوئے صبح کے پرندوں کے ساتھ گیت گاتے ہیں۔ بابا تو مست ہو کے فارسی میں کچھ گانے لگا۔

کمل عجیب انداز میں بولی۔ کیونکہ اس کا منہ شہد کے لقمے سے بھرا ہوا تھا۔

"اوں ـــ وہ ـــ کل رات کو میں نے سنا تھا۔ بابا کی آواز بہت سُریلی ہے۔" پھر لقمہ نگل کر بولی۔

"بابا تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"سائیں ملنگ بابا۔"

"کیا کرتے ہو۔؟"

"خدا کو یاد کرتا ہوں۔"

"زندہ کیسے رہتے ہو۔؟"

"وہ اوپر والا زندہ رکھتا ہے۔ یہ چھوٹی سی ڈھوک باہر ـــ گھر کے باہر دیکھتی ہو۔ اس میں کھرپی چلاکر اتنی زمین تیار کر لیتا ہوں جس سے مکئی کی فصل ہو جاتی ہے۔ جنگل سے شہد مل جاتا ہے۔ چٹنی کے لئے جنگلی پودینہ اور

سالن کے لئے باہر اگائی ہوئی بیلوں سے لوکی ــــ دال ــــ ساگ ــــ سبزی مل جاتی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے اور کیا چاہیئے۔ بس آج کے لئے چٹنی روٹی۔"

"اور کل کے لئے۔؟"

"کل کی فکر کل کرے گا۔ بیٹا کیوں کروں۔؟"

کمل نے بات کا رخ بدل دیا۔ بولی۔

"ملنگ بابا۔ رات کو تم کیا پڑھ رہے تھے۔ بڑا سُریلا گلا پایا ہے تم نے۔"

"ایک ہی کتاب ہے میرے پاس جو میرے پیر نے مجھے دی تھی۔ کہنے لگا۔ اس سے تمہیں سکون ملے گا۔ سکون، امن، شانتی۔"

"یہ کون سی کتاب ہے۔؟"

"مثنوی مولانا روم۔" ملنگ بابا بولا۔

"تم نے پڑھی ہے۔؟"

کمل سر ہلا کر بولی۔

"نہیں۔ تم سناؤ گے کچھ اس میں سے۔؟"

"پہلے تم نیچے جائے غسل کر کے آؤ۔ ہم دونوں اسی لئے پہلے اٹھ کر جھیل پہ نہا دھو کے آئے تاکہ تم اکیلی جا سکو۔ وہاں کنارے پر بہت سی چٹانوں کا پردہ بھی ہے۔ اور کنارے کنارے جھیل گہری بھی نہیں ہے۔ اگر تیرنا نہیں جانتی ہو تو جھیل کے اندر دور تک نہ جانا۔"

٭ ٭ ٭

بہت دنوں کے بعد کمل اس طرح کھلے میں نہائی۔ کھلا آسمان، دمکتا سورج، میلوں تک پھیلا ہوا۔ نیلا نیم گرم پانی۔ سنہری ریت اور چٹانیں چھوڑ کر دور دور تک سبزہ زار اور سبزہ زار سے اوپر جنگل اور جنگل میں خوش الحان طیور کا سنگیت۔ کمل بہت دیر تک نہاتی رہی۔ پور پور میں شانتی اور سکون کا احساس جاگ گیا۔ نہاکر دیر تک ساحل کی ریت پر لیٹی دھوپ سینکتی رہی۔ اسے اس بات کا کوئی احساس ہی نہ رہا کہ اس نے کوئی کپڑا نہیں پہن رکھا ہے۔ بھلا کیا مچھلیاں کپڑے پہنتی ہیں۔؟ انسان کے سوا کون سا جانور کپڑے پہنتا ہے۔ اس سنہری دھوپ میں اس کے ننگے بدن کا انگ انگ فطرت سے ہم آہنگ ہوکر گنگنانے لگا۔ یکایک چند لمحوں کے لئے اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ساری تلاش لا حاصل ہے۔ اگر اسے یہاں ساری عمر کے لئے رہ جانا پڑے تو بھی وہ خوش رہ سکتی ہے۔ پھر اگلے چند لمحوں میں بہت دور سے دوسرے خیال آئے اور ان خیالوں میں لپٹی ہوئی تہذیب کا جال اس پر چھا گیا اور وہ یکایک جست لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک چٹان کے سائے میں جاکر کپڑے پہننے لگی۔

٭ ٭ ٭

مثنوی مولانا روم اس کے سامنے کھلی تھی اور سائیں ملنگ گا رہا تھا۔

صوفیئے می گشت در دورِ افق
تا شبے در خانقاہے شد قنق
یک بہیمہ داشت در آخور ببست
او بصدرِ صفہ با یاران نشست
پس مراقب گشت با یارانِ خویش
دفترے باشد حضورِ یار بیش
دفترِ صوفی سواد و حرف نیست
جز دلِ اسپید ہمچوں برف نیست
زادِ دانشمند آثارِ قلم
زادِ صوفی چیست انوارِ قدم

یکایک سائیں ملنگ چپ ہو گیا۔ اس نے کتاب کو بند کیا۔ اسے چوما۔ ماتھے سے لگایا اور کتاب کو طاق پر رکھ دیا۔

کملی بولی۔ "سائیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

سائیں بولا۔ "تو سن بیٹی۔ ایک صوفی مردِ سیاحِ جہاں، رات کو تھا خانقاہ میں مہماں، تھان میں چوپائے کو وہ باندھ کر، دوستوں کی صف میں بیٹھا بے خطر، وہ مراقب ہم نشینوں میں ہوا اور قریبِ دوست کا دفتر کھلا۔ دفترِ صوفی ہے بے حروف و روایت برف سی اُجلی ہے دل کی کائنات

توشہ عاقل ہیں یہ نقش و قلم، توشہ صوفی ہیں انوارِ قدم۔ اب تو سمجھ گئیں۔؟"

کمل سر ہلا کر بولی۔ " میں تو کچھ نہیں سمجھی۔"

ملنگ بولا۔ "تو مختصر کہتا ہوں۔ میرا توشہ تو یہ کتاب ہے۔ تمہارے توشے میں کیا ہے۔؟"

دلیپ نے جیب سے سونے کے ترپے نکالے۔ بولا۔

"بابا۔ ہمارے توشے میں یہ ہے۔ اب ہمیں سونے کا آخری ترپا چاہیئے۔ اور وہ اسحاق کے پاس ہے جو مرحوم نواب کا گویا تھا۔ اور جسے نغمے کا ایک ترپا مرتے وقت نواب نے دیا تھا۔ ہم اسی اسحاق کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں۔ اور کسی نے ہمیں بتایا کہ برسوں پہلے ایک لکڑ والے نے اُسے درّے کو پار کر کے اِدھر آتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ملنگ بابا دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔

"تو تم اسحاق کی تلاش میں آئے ہو۔؟"

"ہاں بابا۔" کمل بولی۔

"اسحاق تو مر چکا۔!" ملنگ بابا نے آہستہ سے کہا۔

"اس کے چار بچے تھے۔ اور ایک بیوی۔" دلیپ کو ساری فایل ازبر یاد تھی۔ "ان کا کیا ہوا۔؟"

"پہلے وہ مرے۔ ایک ایک کر کے جب اس کے چاروں بچے مر گئے، پھر بیوی بھی مر گئی تو یکایک اسحاق کے دل کے اندر سے دنیا

کا لالچ بھی مر گیا اور وہ فقیر ہو کر اس جھونپڑی میں آن بیٹھا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔"

"تو تم ہی اسحاق ہو۔؟" کمل ذرا بلند آواز میں بولی۔

بابا نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"تو وہ سونے کا پتر ابھی تمہارے پاس ہو گا۔؟"

"ہاں وہ میرے پاس ہی ہے۔"

"دکھا سکتے ہو۔؟"

"رات کو میں نے اس پر چٹنی پیسی تھی۔"

"کیا مطلب۔؟"

فقیر اپنی جگہ سے اٹھا اور چولہے کے پاس گیا۔ پتھر کی ایک سل کو اٹھا کے لایا جس پر سونے کا پترا منڈھا ہوا تھا۔ ہاتھ سے اچھی طرح سے صاف کر کے اس نے یہ منڈھا ہوا پترا دلیپ اور کمل کو دکھایا۔

دونوں اسے دیکھتے رہ گئے۔

کمل چیخی۔ "مگر بابا۔ اس پر نقشے کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ چٹنی پیستے پیستے کان کے سارے نشان غائب ہوتے گئے۔"

"کیا کہتے ہو۔؟" دلیپ چیخا۔

"جو تم سن رہے ہو۔" بابا آہستہ سے بولا۔

"یعنی۔؟" کمل حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "یعنی تم نے دو پیسے کی

چٹنی کی خاطر کان کا نقشہ غائب کر دیا۔"

"مگر یہ بھی تو سوچو۔ چٹنی کس قدر عمدہ تھی۔ رات کو تم اس کی کس قدر تصدیق کر رہی تھیں۔"

کمل نے مجبور ہو کر دانت پیس لئے۔ پھر ناامیدی سے چپ ہو گئی۔

دلیپ بولا۔" بابا۔ ایسا تم نے کیوں کیا۔ ؟ ایسا تم نے کیوں کیا۔؟"

ملنگ بولا۔" بہت دیر بعد یہ حقیقت مجھ پر کھلی کہ زندہ رہنے کے لئے، خوش رہنے کے لئے بہت زیادہ مال کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت کم مال کی ضرورت ہے۔ بس اتنا ہی جتنا فطرت ہمیں دیتی ہے۔ قدرت ہمیں دیتی ہے۔ اس کو قبول کرنے میں خوشی ہے۔ جہاں تم نے فطرت کا سینہ توڑ کر زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کی، بہت کچھ کھو دیا۔ تم نے۔ سونے کی کان میں جا کر سونا حاصل کرنے کے بعد یہ حقیقت مجھ پر کھلی....."

" تم سونے کی کان تک جا چکے ہو۔ ؟" دلیپ اک گہری شدت سے چیخا۔

ملنگ نے چولہے پر رکھے توے کی طرف اشارہ کیا۔" اس توے کی کالی سطح کو کھروچ کے دیکھو۔"

دلیپ نے جلدی سے اس توے کے پاس جا کر اس پر دو، تین کھروچے مارے۔ دو چار سنہری لکیریں کالی سطح کے اندر سے برآمد ہو کر چمکنے لگیں۔

"ارے یہ تو سونا ہے ۔!" دلیپ نے بجاری توے کو ہاتھ پر اٹھا کر کہا۔

"وہ مٹی کے گھڑے پر جو ڈھکن رکھا ہے، اسے بھی کھرچ کر دیکھو۔" نیلے بھورے ڈھکن کو کھرچنے سے بھی اندر سے سونے کی دھاریں سی پھوٹ پڑیں۔

"اب تو یقین آیا۔؟" فقیر ایک کونے کی طرف جاتا ہوا بولا۔ چند چٹانوں کے نیچے سے سونے کے دو چار چھوٹے بڑے ننگ ڈ ٹکڑے نکال کر لایا۔ انہیں دکھا کر بولا۔ "اب تو یقین کرو گے۔؟"

"ہاں — ہاں — بابا۔" دلیپ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

"مگر ہمیں بھی اس کان کے درشن کرا دو۔ اتنی دور سے آئے ہیں۔"

"جو دل کے اندر نور رہتا ہے، اُسے روشن کیوں نہیں کرتے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" کمل سر ہلا کے بولی۔

"ہمیں وہ سونے کی کان چاہیئے۔"

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ پھر جب میرے چاروں بچے ہیضے میں مر گئے اور میری بیوی ان کے غم میں ہلکان ہو کر مر گئی تو میں نے سچ کو پہچانا اور سچ ہی سونا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔" دلیپ غصے سے بولا۔

"اور اس دنیا میں دولت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دولت ہی آخری طاقت ہے۔" پھر وہ یکایک نرم پڑ گیا۔ اس نے جھک کر بابا کے پاؤں

چھوٹے۔ بولا۔ "بابا کسی طرح ہمیں اس سونے کی کان کے درشن کرا دو۔ بس۔"

جب دلیپ بابا کے پاؤں چھو کر اٹھا تو ملنگ نے اسے اداسی سے گلے لگایا۔ بولا۔

" اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو یہی ہوگا۔ میں تمہیں ضرور اس کان تک لے چلوں گا۔ کل صبح تک صبر کر جاؤ۔ اچھی طرح آرام کر لو۔ آگے کا سفر بہت مصیبت کا ہے۔"

O

دو دن وہ تینوں شمال مشرق کی جانب، کبھی اونچے پہاڑوں، کبھی گہری کھائیوں، کبھی برف سے لپٹی وادیوں میں سے گزرتے رہے۔ دو دن کے بعد وہ ایک ایسی پہاڑی چوٹی پر پہونچے جس پر مغلوں کا ایک پرانا قلعہ کھڑا تھا۔ یہ قلعہ آدھے سے زیادہ ڈھے گیا تھا۔ مگر جو باقی بچا تھا۔ وہ اب بھی خاصی مضبوط حالت میں تھا۔ بابا بولا۔

"مغل بادشاہوں کے قدم بس یہاں تک پہونچے۔ تبت کی طرف یہ ان کی آخری چوکی تھی۔ آگے کا قلعہ بالکل غیر آباد ہے۔"

"کوئی حرج نہیں۔" دلیپ بولا۔

"میرے رک سیک (Ruck Seek) میں پندرہ دن کے کھانے کا انتظام ہے۔ بسکٹوں کے ڈبے اور جیم کے ٹن اور بہت سے آبلے ہوئے

انڈے، نمک کالی مرچ، پنیر کے ڈبے اور مکھن کے، سب ہی کچھ تو اسی آخری ایکسپی ڈیشن کے لئے سری نگر سے لیکر چلا تھا۔ ابھی تک ایک ڈبہ بھی نہیں کھولا ہے۔"

سورج مغربی چوٹیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اور جنوب سے کالے کالے بادلوں کے پرے کے پرے نمودار ہو رہے تھے۔ ہوا میں خنکی یکایک بڑھ گئی تھی۔

"آج رات یہیں آرام کریں گے۔ اس سے محفوظ جگہ آگے شاید کہیں نہیں ملے گی۔" ملنگ بابا نے کہا۔

کمل نے اپنا سامان کندھے سے اتارا۔ دلیپ نے اپنا بوجھل رک سیک جو اس کے کندھے کے پیچھے بندھا تھا۔ ڈھیلا کرکے آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔

اب وہ تینوں قلعے کے ایک کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے نیم دراز ہو گئے تھے۔ شام ہوتے ہوتے جب اندھیرا بڑھنے لگا۔ تو تاریکی چھا جانے سے پہلے دلیپ نے بسکٹوں کا ایک ڈبہ کھولا۔ اور وہ تینوں صبح کے بھوکے تو تھے ہی، سب نے ڈٹ کر کھایا۔ کرکرے بسکٹوں پر مربہ، مکھن یا پنیر لگاتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے وہ تینوں بسکٹوں کا آدھا ڈبہ چٹ کر گئے۔ پھر قلعہ کے باہر جا کے اس کے عقبی حصے میں بہنے والے چشمے کا پانی پیا اور آرام سے آ کر وہ تینوں کمرے میں سو گئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ ایسی گہری نیند سوئے کہ گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہی۔

یکایک دلیپ کو کسی نے زور کی ٹھوکر ماری۔ دلیپ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے سامنے اس کا چچا جسونت سنگھ پستول تانے کھڑا تھا جسونت سنگھ کے پیچھے دھوپ کی اجلی کرنیں ایک سنہرے غبار کی طرح کمرے میں داخل

جو رہی تھیں۔

دلیپ نے سوچا اتنی دیر تک وہ کیسے سوئے رہے۔

"اٹھو۔" اس کے چچا نے گرج کر کہا۔

"اٹھتا ہوں۔" دلیپ بولا۔

"مگر چچا پستول کیوں تانے ہوئے ہو۔؟"

"تم اکیلے ہی سونے کی کان دریافت کرنے جا رہے تھے حرامی۔"

چچا نے گرج کر کہا۔

دلیپ کو غصہ آنے لگا۔ بیزاری سے بولا۔

"تو تم کو کیسے ڈھونڈتا۔؟ تم نے خود کہا تھا۔ میں تم کو ڈھونڈ لونگا۔ سو تم نے ڈھونڈ لیا۔ اب شکایت کس بات کی۔؟"

"وہ سونے کے پترے کہاں ہیں۔؟"

اب تک ملنگ بابا اور کمل دونوں جاگ گئے تھے۔ اور حیرت سے جسونت اور دلیپ کی باتیں سن رہے تھے۔

جسونت نے ان تینوں کی طرف پستول گھماتے ہوئے کہا۔

"جو بھی اپنی جگہ سے حرکت کرے گا۔ میرے پستول کی گولی کا نشانہ بن جائے گا۔"

جسونت سنگھ کی آواز میں ایسی دھمکی تھی جو بالکل سچ معلوم ہو رہی تھی۔

جسونت سنگھ نے پھر دوہرایا۔ "بولو! کدھر ہیں وہ سونے کے پترے۔"

کمل نے اپنی جیب سے وہ سونے کے پترے نکال کر جسونت سنگھ کے سامنے پھینک دیئے۔

"یہ لو، سنبھالو ان کو۔"

"یہ لڑکی کون ہے۔؟" جسونت سنگھ نے دلیپ سے پوچھا۔

"وہی لڑکی ہے جس کے ساتھ میں نے پارٹنر شپ کی ہے۔ آپ کو بمبئی سے ٹرنک کال پر بتایا تو تھا۔"

"وہ پارٹنر شپ بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی یہ بتاؤ۔ اس نقشے میں ایک ٹکڑا اہم کیوں ہے۔؟"

"وہ ٹکڑا میرے پاس تھا۔" بابا نے کہا۔

"تو نکالو اپنی جیب سے۔"

"وہ سونے کا پترا اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میرے جھونپڑے میں ہے مگر اب وہ سونے کا ٹکڑا بیکار ہے۔ اس پر چلتی پیتے پیتے سارا نقشہ گھس گیا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" جسونت نے گرج کر کہا اور پستول کی نالی کا رخ سائیں ملنگ بابا کی طرف کر دیا۔

ملنگ نے مسکرا کر کہا۔

"مدت ہوئی میں نے جھوٹ بولنا ترک کر دیا۔"

"کون ہو تم۔؟"

"پہچانتے نہیں ہو۔ کیا میری صورت اتنی بدل گئی ہے۔ میں

اسحاق ہوں۔ نواب صاحب مرحوم کا گویا۔ اور اب ایک فقیر......"

"دو منٹ میں وہ پترا مجھے دید و ورنہ یہ گولی تمہارے سینے کے پار ہوگی۔" جسونت سنگھ نے گرج کر کہا۔

"اگر اللہ کی مرضی یہی ہے کہ تمہاری گولی سے مروں تو ایسا ہی ہوگا۔" دلیپ نے کہا۔

"نہیں چاچا، یہ ملنگ سچ کہتا ہے۔"

"تم تینوں جھوٹے ہو ـــــ وہ سونے کا پترا حاصل کر کے رہوں گا۔" جسونت سنگھ بولا۔

"دیوار کی طرف تم تینوں منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ دس تک گنونگا اور اگر دس کی گنتی تک پترا میرے ہاتھ نہ آیا تو تم تینوں کو گولی مار دوں گا۔"

کمل اب تک جسونت سنگھ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ ملنگ بابا اور دلیپ کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

جسونت سنگھ بولا۔

"ایک۔!"

"دو۔!!"

"تین۔!!!"

"چار۔!!!!"

ملنگ بڑے سکون سے بولا۔ "دس کیا، دس ہزار تک گن لو جب بھی

وہ پتر اب تمہیں نہیں مل سکتا۔ رہا مرنے کا سوال تو اگر اللہ کی مرضی اسی میں ہے تو ہم تینوں تمہارے ایک پستول سے مر جائیں گے۔ اور اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو دس پستول بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔"

"پانچ۔!"

"چھ۔!"

"سات۔!"

"آٹھ۔!"

"نو۔!"

نو کہتے ہوئے جسونت سنگھ کو زور کا ایک دھکا پیچھے سے لگا۔ اور اس کا پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ مڑ کر دیکھتا ہے تو اس کے پیچھے میجر کھڑا ہنس رہا تھا۔ اور میجر کے پیچھے جیوتشی جی ریوالور تانے کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ مول چند شاہ اور مول چند شاہ کے ساتھ نینی تال کے ٹھاکر سنگھ راوت .... سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

کمل، بابا ملنگ اور دلیپ تینوں آہستہ سے دیوار کی طرف سے مڑے اب ان کا رخ سب لوگوں کی طرف تھا۔

میجر بولا۔ "جسونت سنگھ، تم نے چال تو اچھی چلی تھی مگر بات بنی نہیں۔ عین موقع پر بگڑ گئی۔ اب وہی ہونے والا ہے جیسا کہ مرحوم نواب نے کہا تھا۔ اس کان کو دریافت کریں گے تو ہم سب اکٹھے ورنہ سب اکٹھے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔"

جسونت سنگھ نے دانت پیس کر کہا۔ "واپس ہی جانا پڑیگا کیونکہ نقشے کا آخری پترا غائب ہے۔"

"کیسے غائب ہے۔؟"

سائیں ملنگ بابا کی طرف اشارہ کر کے جسونت سنگھ بولا۔

"اسحاق کے پاس تھا۔ مگر اسحاق نے دنیا اور دولت کو چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی۔ اور اس پترے پہ چلمیں پیتا رہا۔ اور گھستے گھستے اس پترے سے نقشے کا آخری حصہ غائب ہو گیا۔"

میجر نے اسحاق کی طرف دیکھ کر زور سے کہا۔

"الو کا پٹھا۔ سودائی۔"

ملنگ مسکرایا۔ پھر یکایک اونچی آواز میں گانے لگا۔

"باز دیوانہ شدم من اے طبیب
باز سودائی شدم من اے حبیب
حلقہائے سلسلہ تو زد جنوں
ہر یکے حلقہ دہد دیگر جنوں
دادِ ہر حلقہ جنونے دیگر است
پس مرا ہر دم جنونے دیگر است
ہو گیا دیوانہ پھر میں اے طبیب
ہو گیا سودائی پھر میں اے حبیب
حلقہ زنجیر میں ہیں دو کمال!

حلقے حلقے میں جنوں کا ہے وبال
حلقے حلقے میں جنوں ہے دوسرا
مجھ کو ہر لحظہ جنوں ہے دوسرا"

جب ملنگ چپ ہوا تو ولیپ بولا۔" اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔"

"تم چپ رہو۔" ملنگ سختی سے بولا۔

"میں ان دونوں کو سونے کی کان دکھانے جا رہا تھا۔ تم سب لوگوں کو بھی دکھا دوں گا۔ تم سب میرے ساتھ چلو مگر میری بھی ایک شرط ہے۔ یہ دونوں آپ کے ساتھ اس کان کے سونے کے برابر کے حصے دار ہوں گے۔ اگر آپ کو یہ شرط منظور ہے تو میں آگے چلتا ہوں۔ ورنہ تم ابھی مجھے گولی مار دو۔ یہ لڑکا اور یہ لڑکی تم سب کے ساتھ برابر کے حصے دار ہوں گے سمجھ گئے میری شرط۔ ؟"

اتنا کہہ کر ملنگ نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور بلند آواز میں گانے لگا۔

" ایں جہاں نیست چوں ہستاں شدہ
واں جہاں ہست بس پنہاں شدہ
اسیر جہاں نیست ہے ہستی نما
وہ جہاں پنہاں ہے جو ہے ہست کام"

میجر نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ سب نے ہاں

کہہ کر سر ہلا دیا۔ تو میجر ملنگ سے بولا۔

"ہمیں منظور ہے۔ اب آگے چلو اور راستہ دکھاؤ۔"

ملنگ آگے آگے چلا۔ پیچھے پیچھے جسونت سنگھ، میجر، ٹھاکر سنگھ راوت، مولچند شاہ اور جیوتشی نند دلارے۔

دلیپ نے میجر سے پوچھا۔

"اور آپ کا وہ سائنسداں دوست بلونت سنگھ کہاں رہ گیا۔؟"

میجر بولا۔ "راستے میں اس کا پاؤں پھسلا برف پر سے اور وہ ایک گہری کھائی میں گر کر مر گیا۔۔۔۔۔۔۔ چلو، چلو، زیادہ باتیں مت کرو۔ جو گیا سو گیا۔ اس کا کیا غم۔ اپنی جان کی خیر مناؤ لڑکے۔!"

دلیپ کے دل میں طرح طرح کے شبہات لرزنے لگے۔ کیا معلوم وہ کھڈ میں گر گیا یا اسی میجر نے اسے کسی کھڈ میں گرا دیا یا جان سے مار کر برف میں دبا دیا۔ اب وہ یہ کبھی نہ معلوم کر سکے گا۔ مگر کچھ معلوم کرنے کا موقع بھی نہ تھا۔ ملنگ بہ آواز بلند گاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اور پیچھے پیچھے باقی لوگوں کا قافلہ اس کے پیچھے پیچھے بڑھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

چار دن کے کڑے کوس بے حد تھکا دینے والے تھے۔ مگر چلتے ہی رہے۔ کہیں پر ایسی اونچائی کہ بکری یا مارخور کا پاؤں بھی نہ ٹک سکے۔ کہیں پر

بارش کہیں پر برفباری تیز ہوا کے جھکڑ، طوفان۔ ایک جگہ تو انہیں ایک چشمے کے آبشار کے اندر سے گزرنا پڑا۔ مگر وہ لوگ چلتے ہی رہے۔ رات...... میں تین چار گھنٹے کے لئے کسی پہاڑ کی کھوہ میں یا چٹان کی کسی بڑی دراڑ میں آرام کرتے اور پھر آگے چل دیتے تھے۔

چوتھے دن کی برفباری کے بعد ملنگ کے پاؤں ایک بلند و بالا پہاڑ کی طرح اونچے گلیشیر کے قدموں میں رک گئے۔ اب ان کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔ برف کا ایک بڑا گلیشیر تھا۔ جو حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔

"اب کدھر جائیں گے۔" جسونت سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں اس گلیشیر پر تو چڑھ نہیں سکتے۔ تازہ تازہ برفباری میں کمر تک دھنس جائیں گے۔

ملنگ عجیب طرح سے ہنسا بولا "کسی کے پاس کدال ہے۔؟"

دلیپ نے اسے اپنی کدال دی۔

ملنگ کچھ دیر تک غور کرتا رہا۔ دو چار جگہ سے اس نے کافی غور کرنے کے بعد برف کو کدال سے کھودا۔ پھر یکایک ایک جگہ کی برف صاف کرتے کرتے رک گیا۔ زور سے چلایا۔ "سبحان اللہ۔"

"کیا ہے۔؟" راوت نے پوچھا۔

"ادھر آ کے دیکھو۔" ملنگ فاتح نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

وہ سب لوگ اس کے قریب آ گئے۔

"جھک کر دیکھو۔"

سب لوگ جھک کر دیکھنے لگے۔

جہاں پر ملنگ بیٹھا تھا وہاں سے گلیشیر کے اندر ایک لمبی قدرتی ٹنل بنی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ کوئی دو سو گز لمبی ٹنل جو گلیشیر کے عین بیچ سے ہو کر دوسری طرف جاتی تھی۔ ٹنل کے دوسری طرف سنہری دھوپ کی پرچھائیاں اندر لرز رہی تھیں۔ اجالے کا ہالہ سا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔

"اس ٹنل کے دوسری طرف وہ سونے کی کان ہے۔ یہ سنہرا پن جو تم ٹنل کے دوسری طرف دیکھتے ہو، یہ وہ سنہرا جالا ہے۔ جب دھوپ سونے کی چٹانوں پر سے پھسل کر اس ٹنل کے اندر آتی ہے۔"

چند لمحوں تک وہ سب ہکا بکا اس منظر کو دیکھتے رہے۔ پھر سب ایک ساتھ بولے۔ "چلو، چلو آگے قدم بڑھاؤ۔"

"ٹھہرو۔" ملنگ نے ان سب کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "اب میں کہتا ہوں لالچ مت کرو۔ تم سب لوگ آرام کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور اس کان کا خیال چھوڑ دو۔"

میجر نے ایک زور کا ہاتھ ملنگ کے سینے پر مارا۔ ملنگ ایک طرف جا گرا۔

میجر نے پستول نکال کر اسے دکھایا۔ "آگے بڑھتا ہے کہ ماروں ایک گولی۔"

ملنگ برف سے اٹھا۔ بولا۔ "یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کر دیا۔ اب تم سب لوگ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

یہ ٹنل اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے کھڑے ہو کر گذرا نہ جا سکتا تھا۔ ملنگ ٹنل کی برف پر گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ دوسرے سب لوگ بھی اس کی تقلید میں چوپایوں کی طرح چلنے لگے۔

یہ ٹنل کسی نے بنائی نہیں تھی۔ خود بخود کسی فطری عمل سے بن گئی تھی۔ ٹنل کے چاروں طرف کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے بلور کی شکل کے آویزوں کی مانند ٹنل کی دیوار سے نکلتے ہوئے برف کے ٹکڑے راستہ روکتے نظر آتے۔ ملنگ انہیں کدال سے توڑتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دو سو گز کا فاصلہ انہوں نے ڈھائی تین گھنٹے میں طے کیا۔ جب وہ لوگ ٹنل کے دوسری طرف باہر نکلے تو انہوں نے ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔

ایک چھوٹی سی گہری وادی تھی، کنوئیں کے مانند اور اس کے چاروں طرف اونچے اونچے نکیلی چٹانوں والے برف سے اٹے ہوئے پہاڑ کھڑے تھے۔ کہیں پر برف تھی۔ کہیں پر چٹانیں ننگی تھیں۔ خاص طور پر وادی کے قدموں میں پہاڑی چٹانیں بالکل ننگی تھیں اور ان میں سونے کی دھاریاں اور سونے کی سلیں کی سلیں سیکڑوں فٹ لمبی، تیسرے پہر کی آفتاب کی روشنی میں کندنی کی طرح دمک رہی تھیں۔ وادی کی زمین پر بھی سیکڑوں چھوٹی موٹی چٹانیں اور چٹانوں کے زرّیں ٹکڑے اسی سنہرے رنگ میں نہا کر جگمگا رہے تھے۔

کئی لمحے گذر گئے۔ کئی منٹ گذر گئے اسی خاموشی میں۔

پھر یکایک وہ سب لوگ چیخ مار کر وادی میں بکھری ہوئی چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے مگر بےحد بھاری سونے کے ٹکڑوں کو چُن چُن کر اپنی جیبوں میں بھرنے لگے۔ ...... کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب لوگ دیوانہ وار سونے کے ٹکڑے چُننے میں مصروف تھے۔

دلیپ نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔

یہ ملنگ تھا۔

ملنگ بولا۔ "میں واپس جاتا ہوں۔"

میجر نے کہا۔ "خالی ہاتھ کیوں جاتے ہو۔ سونے کے دس پندرہ ٹکڑے تم بھی لیتے جاؤ۔ زندگی بھر آرام سے رہو گے۔"

ملنگ نے ایک عجیب نگاہ ان سب پر ڈالی۔ سکون آمیز آواز سے بولا۔

"نہیں، میرے لئے وہ چٹنی روٹی بہت ہے۔"

جیوتشی نند دلارے نے جسونت سنگھ سے کہا۔ "پگلا ہے ——— اسے جانے دو۔"

یوں بھی کس کو فرصت تھی کہ ملنگ کو سمجھاتا۔ سب اِدھر اُدھر گھوم کر سونے کے ٹکڑے ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ ملنگ ان کو چھوڑ کر کب واپس ہوا کس کو خبر تھی۔؟

دن ڈھلتے اور رات ہونے تک اتنا سونا ان لوگوں نے اکٹھا کر لیا تھا کہ جو اُن کی سات پشتوں کے لئے کافی تھا۔ اتنا سونا جسے وہ بمشکل اٹھا کر واپس

جا سکتے تھے۔ پھر بھی ٹکڑوں پر ٹکڑے اپنی جیبوں میں ٹھونستے جا رہے تھے۔

جب تاریکی چھانے لگی تو سب لوگ رات کے کھانے کے لئے ایک بڑی اور آگے ابھری ہوئی چٹان کے نیچے والی قدرتی کھوہ میں جمع ہو کر کھانے میں جٹ گئے۔ سب کے پاس ایک ہی طرح کا کھانا تھا۔ بسکٹ اور پنیر، مکھن اور نان۔ یا سیب کا مربہ اور آم کا اچار۔ اچھی طرح کھا پی کے سب نے سونے کا ارادہ کیا اور طے یہ پایا کہ واپسی کا راستہ کل ہی میجر کی قیادت میں طے کیا جائے۔

جب نیند کا غلبہ گہرا ہوا تو دلیپ نے آہستہ سے کمل کو جگایا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اٹھا کر کھوہ کے باہر لے گیا۔

چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ صرف مغرب سے بادلوں کا ایک ٹکڑا نمودار ہو رہا تھا۔ وادی میں سونے اور چاندی کی آمیزش تھی۔ چاروں طرف برف سے لدے پہاڑ، وادی کی سنہری باہنوں میں کنگن کی طرح چمک رہے تھے۔ وادی برف کا اجلا لباس پہنے اپنے محبوب کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اور سونے کی سنہری دھاریاں کندنی ریشمی بالوں کی طرح اس کے شانوں پر بکھر گئی تھیں۔

"خوب صورت۔! خوب صورت۔!" کمل آہستہ سے بولی۔

دلیپ بولا۔ "میں نے ایک دوسری کھوہ دیکھ رکھی ہے۔ وہاں چل کر آرام کریں گے۔ رات بھر نہیں سوئیں گے۔"

"کیوں نہیں۔؟"

"خطرہ ہے۔"

"کس بات کا خطرہ۔"

"پتہ نہیں، دل رہ رہ کر ڈر سا جاتا ہے۔"

"بڑے بہادر ہو جی تم ۔! سب تو سو رہے ہیں۔ اور تم ڈر گئے۔ کس بات کا ڈر ہے۔ کہیں دوسری کھوہ میں مجھے لیجا کر......" وہ رک گئی۔

دلیپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تو اتنے دن تم نے مجھ پر کیوں بھروسہ کیا۔ اور کیا کبھی تمہارے جسم کو کسی رات میں نے چھوا تک بھی ــــ بولو۔"

کمل کے شانے کانپے، بولی۔ "باہر بہت سردی ہے۔ چلو کسی دوسری کھوہ میں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے مغربی سمت میں چلے گئے لگتا تھا دلیپ نے وہ کھوہ اچھی طرح یاد کر رکھی ہے۔ اسے اس کھوہ کو ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ جلدی سے چاروں طرف دیکھ کر کمل کا ہاتھ پکڑ کر اس کھوہ میں داخل ہو گیا۔ اس کھوہ میں بڑی مشکل سے دونوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ سونے کی نہیں تھی۔ وہ دونوں اس کھوہ میں بیٹھ گئے۔

"یہ کیا حماقت ہے۔ اس کھوہ میں کتنا آرام تھا۔ پاؤں پسار کے سو رہے تھے۔"

"ہو سکتا ہے یہ حماقت ہو۔ ہو سکتا ہے بیوقوفی ہو۔ صبح تک جاگتے رہنے ہی سے معلوم ہو گا کہ میرا ادیہہ سچا ہے کہ جھوٹا۔"

"اونہہ۔!" کہہ کر کمل نے بڑی ادا سے اس سے منہ پھیر لیا، جیسے کہہ رہی ہو۔ "تمہارے ایسا گدھا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔"

رات کے دو بجے ہوں گے۔ جب میجر نے آنکھ کھولی۔ کھوہ میں گھُپ اندھیرا تھا۔ میجر نے اپنی پنسل ٹارچ روشن کی اور اس کی پتلی باریک اور مدھم روشنی میں اس نے جسونت سنگھ کا چہرہ دیکھا۔ پھر دھیرے دھیرے دوسرے چہروں پر نظر ڈالی۔ سب سو رہے تھے۔ میجر نے آہستہ سے جسونت سنگھ کو جگایا اور اپنے ہونٹ اس کے کان سے لگا کر کچھ ایسی سرگوشی میں کہا۔ جسے صرف جسونت سنگھ ہی سن سکتا تھا۔

جو کچھ جسونت سنگھ نے سنا اسے سنکر وہ میجر کے ساتھ کوئی آواز پیدا کئے بغیر کھوہ سے باہر آگیا۔

میجر اسے کھوہ سے دور لے گیا۔ جہاں سے وہ کھوہ سے نکلنے والے آدمیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن کھوہ کے اندر رہنے والے یا اس سے باہر نکلنے

والے اُسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میجر بولا۔ "راستہ میں تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بلونت سنگھ سائنسداں کا کیا ہوا۔؟ اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کھڈ میں گر کر مر گیا۔ اس میں صرف ایک حصّہ سچ تھا۔ پورا سچ یہ ہے کہ میں نے ہی اسے کھڈ میں گرا دیا تھا کیونکہ اس نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ کان دریافت کرنے کے بعد اور اس میں سے اپنی خواہش کے مطابق سونا اٹھا لینے کے بعد وہ اس کان کی دریافت کی خبر سرکار کو دے دیگا۔ میں نے اس کی تجویز سن کر اس کی پیٹھ ٹھونکی تھی مگر دل ہی دل میں اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"تمہارا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔" جسونت بولا۔

"اب تمہیں ایک ــــ دوسرے فیصلے کا ہمراز بناتا ہوں۔ کھوہ میں جتنے آدمی سو رہے ہیں ان سب کو ختم کر دیا جائے۔ کیا خیال ہے تمہارا۔؟"

"نیک خیال ہے۔" جسونت سنگھ بولا۔ "مگر دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کیا کہ سب کو مار کر وہ میجر کو بھی ختم کر دیگا۔ تاکہ وہ اس سونے کی کان کا واحد مالک رہے۔ اور اس کان کا راز اس کے سوا اور کسی کے پاس اس دنیا میں نہ رہے۔

عین اسی وقت میجر نے بھی یہی سوچا۔ سب کو ختم کر کے میں جسونت سنگھ کو بھی ختم کر دوں گا۔ کان کا مالک ایک ہی ہونا چاہیئے۔

"تو ہاتھ ملاؤ۔" میجر بولا۔

جسونت سنگھ نے بڑی مضبوطی سے میجر سے ہاتھ ملایا کیونکہ وہ خود

بھی ایک تگڑا مضبوط آدمی تھا۔

"اندر کھوہ میں سب سو رہے ہیں۔" میجر بولا۔ "یہی وقت سب کو ختم کر دینے کے لئے سب سے اچھا ہے۔"

جسونت سنگھ سوچ سوچ کر بولا۔ "میں ٹھاکر سنگھ راوت کو ختم کرتا ہوں۔ تم جیوتشی جی کا گلا دبا دو مگر اس طرح کہ آواز نہ ہو۔ اس کے بعد مولچند شاہ کو ختم کرنا کوئی مشکل نہ ہوگا۔"

"اور وہ لڑکا اور لڑکی کدھر گئے۔؟" میجر نے پوچھا۔

"کون دلیپ اور اس کی ساتھی۔؟" جسونت سنگھ بڑی لاپرواہی سے بولا۔ "میرے خیال میں کسی دوسری کھوہ میں رومانس لڑا رہے ہوں گے۔ پہلے ان بھائیوں کو ختم کر دیں، پھر ان دونوں کو بھی ڈھونڈ کر مچھر کی طرح مسل دیں گے۔"

مگر کھوہ کے اندر جا کر معلوم ہوا کہ جیوتشی جی نے اس طرح کرنٹ لی تھی کہ ان کا گلا دبانا مشکل تھا۔ اس لئے میجر، جیوتشی جی کی بجائے مولچند کی طرف لپکا اور اپنے دونوں بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں سے اس نے مولچند شاہ کی گردن میں شکنجہ کس دیا۔ مولچند شاہ کے منہ سے ایک دبی دبی گڑگڑاہٹ نکلی، جس سے راوت عین اس وقت جاگا جب جسونت سنگھ اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو رہا تھا۔ راوت ہتھنیاں کھاتا ہوا کھوہ کے باہر آگیا اور ننند والا رے نے اپنا ریوالور نکال لیا اور بھاگتا ہوا ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔

میجر نے مولچند شاہ کو ختم کر دیا۔ گردن دبا کر اسے کچھ ایسا محسوس

ہوا جیسے اس نے کسی فٹ بال سے ساری ہوا نکال دی ہو۔ چند منٹ تک وہ اپنے دونوں ہاتھ سہلاتا رہا۔ پھر جب اس کے ہاتھوں کا دباؤ ٹھیک حالت میں آیا تو اس نے جیب سے اپنا ریوالور نکال کر دائیں ہاتھ میں لیا اور بڑی چوکسائی سے کھوہ کے باہر نکلا مگر باہر نکلتے ہی اس پر ایک فائر ہوا۔ گولی اس کی ٹانگ کو چھیل کر آگے نکل گئی تھی۔ میجر نے پلٹ کر فائر کرنے والے کی ایک لمحہ شکل دیکھی اور جوابی فائر کیا۔ یہ جسونت تھا۔

"غدار۔!" میجر چلایا۔ اور اس نے دو تین گولیاں جسونت سنگھ کی طرف داغیں مگر جسونت سنگھ چٹان کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اور میجر زمین پر لڑھک کر بائیں طرف چٹان کی اوٹ میں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں جسونت سنگھ نے میجر پر چار بار گولی چلائی۔ تین گولیوں سے تو وہ صاف بچ گیا۔ چوتھی گولی اس کے دل میں لگی اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

یکایک جسونت سنگھ نے اپنے بائیں کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ فوراً پلٹ کر دیکھا تو ٹھاکر سنگھ راوت تھا۔ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کون کون ختم ہو گئے۔!"

"میرے خیال میں میجر اور کھوہ کے اندر مولچند شاہ کیونکہ وہ ابھی تک کھوہ کے باہر نہیں نکلا۔"

"چلو، اندر چل کے دیکھیں۔"

دونوں کھوہ کے اندر گئے۔ مولچند شاہ کے جسم کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ پھر سیدھے ہو کر راوت نے اسے ایک ٹھوکر ماری مگر ٹھنڈے جسم

سے کوئی حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

"مر گیا۔!" راوت کے منہ سے نکلا پھر وہ جسونت سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "جیوتشی کہاں ہے۔؟"

"باہر بھاگ گیا۔" جسونت بولا۔ "میرے خیال میں وہ اس چٹان کے پیچھے ہے اور ایک ریوالور بھی اس کے پاس ہے۔"

راوت نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف سے بادل گھر کر آ رہے تھے۔ اور ہوا میں ایک تیزی اور خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ چھٹکی ہوئی چاندنی غائب ہو گئی تھی۔ کیونکہ چاند بادلوں کے پیچھے جا چکا تھا۔ روشنی کی ایک ہلکی سی پرت وادی میں باقی تھی۔

راوت نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر اس چٹان کی طرف پھینکا۔ جواب میں جیوتشی نے فائر کیا۔

"ہاں وہیں ہے۔" راوت نے سر ہلا کر کہا۔

یکایک بادل زور سے گرجے۔ بجلی کڑکی پھر چند طویل لمحوں تک بادلوں میں گرج پیدا ہوتی رہی۔ اور ان کی دھمک دیر تک سنائی دیتی رہی۔

"شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔" راوت بولا۔

جسونت نے کہا۔ "اس سے پہلے ہمیں نندلا رے کو ختم کر دینا چاہیئے۔ پھر اس سونے کی وادی کے مالک صرف تم اور میں۔"

"صرف تم اور میں۔!" راوت نے جسونت سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر کے بعد پوچھا۔ "مگر وہ دونوں کہاں ہیں۔ دلیپ اور کمل۔؟"

" ان کا کیا ہے۔ ؟ " جسونت نے بڑی تحقیر سے کہا۔ " بچے ہیں۔ بچ کر کہاں جائیں گے۔ ؟ آخر میں پس میں اور تم۔ ! " پھر دل ہی دل میں اس نے کہا۔ " اور تم بھی کیا۔ ؟ "

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد راوت بولا۔ " مگر اب اسے ختم کیسے کیا جائے۔ ؟ "

" تھوڑا سا خطرہ مول لینا پڑیگا۔ میں بائیں طرف کی چٹان کی اوٹ کا سہارا لے کر اس کی طرف جاتا ہوں۔ تم دائیں طرف سے یہاں سے چند گز کے فاصلے کی چٹانوں کی اوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اس کی طرف جاؤ۔ جس کو پہلا موقع ملے اسے گولی مار دے۔ "

" ہاں یہ ٹھیک ہے۔ "

جسونت سائے کی طرح بائیں طرف چٹانوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ راوت اور پہلی چٹان جو دائیں طرف سے اس کے قریب تھی۔ ان دونوں کے بیچ میں کوئی بیس فٹ کی کھلی جگہ تھی۔ راوت آڑا ہو کر جنک پھریاں لیتا ہوا، سرکتا ہوا اس چٹان کے عقب میں چلا گیا۔ مگر چٹان کی اوٹ میں جانے سے پہلے نند دلارے نے ایک فائر کیا مگر وار خالی گیا۔ تھوڑا سا خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ راوت نے چٹان کے پیچھے جاتے ہوئے سوچا۔ گو اس کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ جسونت سنگھ کو دائیں طرف کی چٹان کے پیچھے جانے میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا پڑا۔

پھر دائیں طرف سے پتھروں اور چٹانوں کی اوٹ کا سہارا

لیتا ہوا جسونت، جیو تشی نند دلارے کی طرف چلا۔ اور بائیں طرف سے انتہائی خاموشی سے، دوسری طرف سے حملے کی تیاری کرتا ہوا راوت گھٹنوں کے بل چلا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب راوت اور جسونت دونوں ہی نند دلارے کے عقب میں تھے اور نند دلارے ان کی پوزیشن سے بے خبر ریوالور تانے سامنے کی چٹان کے پیچھے چھپا ہوا سامنے سے حملے کی توقع کر رہا تھا۔

یکایک ایک پتھر کہیں سے لڑھکا اور نند دلارے خبردار ہو کر چونکا۔ عین اسی وقت دائیں طرف سے جسونت حملہ کرنے کے لئے اٹھا اور بائیں طرف سے راوت۔ نند دلارے نے ادھر دیکھا جس طرف سے پتھر لڑھک کر آیا تھا۔ یکایک اس نے جسونت کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ نند دلارے اسے گولی مارنے کو تھا کہ جسونت زور سے چلایا۔ "پیچھے دیکھو۔ راوت تمہیں مارنے کے لئے آ رہا ہے۔"

بجلی کی تیزی کے ساتھ نند دلارے پلٹ گیا۔ عین اسی وقت جب راوت نے مڑتے ہوئے نند دلارے کے جسم میں تین گولیاں ماریں جسونت سنگھ نے نشانہ باندھ کر راوت کے جسم میں اپنے ریوالور کی ساری گولیاں خالی کر دیں۔

راوت ایک دلخراش چیخ سے جسونت کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے اس کا جسم گرتے ہوئے نند دلارے سے ٹکرایا اور وہ دونوں وہیں

فرشِ خاک پر ڈھیر ہو گئے۔

چند منٹ تک جسونت سنگھ ان دونوں کی لاشوں پر کسی خوفناک سائے کی طرح لہراتے کھڑا رہا۔ پھر کھوہ میں جاکر مولچند شاد کی لاش کے قریب بیٹھ کر ریوالور میں نئی گولیاں بھرنے لگا۔

یکایک باہر سے زور سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے ساری وادی کا دل ہلا دیا۔ پھر زور کی بارش شروع ہو گئی۔ پھر اولے پڑنے لگے۔ اولوں کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اب بڑی تیزی سے برف باری شروع ہو چکی تھی۔

جسونت سنگھ نے جیب سے ایک سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اپنی جیبوں میں لائیٹر تلاش کرنے لگا۔ لائیٹر شاید کہیں گر گیا تھا۔ پھر اس نے مولچند شاہ کی جیب سے سونے کا لائیٹر نکالا۔ اور اس سے سگریٹ سلگایا۔ رات بھر اسے اسی کھوہ میں رہنا ہوگا۔ صبح برف باری بند ہونے کے بعد وہ دلیپ کو تلاش کرے گا۔

دیپ اور کمل نے فائیرنگ کی آوازیں سنی تھیں، پھر وہ دل خراش چیخیں۔ پھر ایسا سناٹا، ایسی خاموشی جو فائیرنگ سے بھی زیادہ وحشت ناک تھی۔

کمل بولی۔ "اب جو کوئی بھی باقی بچے ہیں ہمیں ڈھونڈ رہے ہونگے۔"

دیپ نے کمل کو کھوہ کے پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور خود ریوالور لے کر کھوہ کے سوراخ کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یہ کیوں۔؟" کمل نے اس سے پوچھا۔

"پہلے میں مروں گا پھر تم۔"

"پہلے تم کیوں۔!"

"ایسے ہی۔"

چند منٹ تک تکلیف دہ سناٹا رہا۔ پھر دلیپ بولا۔

"اوّل تو ان لوگوں کو یہ کھوہ ہی نہیں ملے گی۔ اور اگر مل بھی گئی تو ہم دونوں چوکس اور ہوشیار ہیں۔ میرے ریوالور کی رینج میں جو بھی آیا۔ مر جائیگا دلیپ نے بڑی سختی سے کہا۔

پھر زور کے اولے پڑنے لگے۔ پھر زبردست برف باری شروع ہو گئی۔ اور ہوا کے تیز جھکڑ شیطانی سیٹیاں بجاتے وادی میں اودھم مچانے لگے۔

"اب ہم رات بھر کے لئے محفوظ ہیں۔" کمل بولی۔

"ہاں، آج رات تو ادھر کوئی نہیں آئے گا۔" دلیپ بولا۔

"میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔"

"تو سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔"

کمل نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں۔ بیٹھے بیٹھے وہ سو گئی۔ پھر اس کا سر ڈھلک کر دلیپ کے کندھے پر آ رہا۔ دلیپ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلا۔ ایک عجیب سا پیار کمل کے لئے اس کے دل میں امنڈ آیا۔ کتنی بہادر لڑکی ہے یہ۔ بہادر تو ہے مگر آخر تو لڑکی ہے۔ مجھے ساری رات جاگ کر اس کی حفاظت کرنا ہو گی۔

بیچ بیں جھکڑ بہت تیز ہو گیا۔ پھر یکایک ایسی دہشت ناک آواز پیدا ہوئی جیسے لاکھوں توپیں ایک ساتھ چل گئیں۔ ڈھڑا ڈادھم .... جیسے کہیں بہت قریب کوئی بڑا پہاڑ گر کر پاش پاش ہو رہا ہو۔ آدھے گھنٹے

تک یہ خوفناک آوازیں آتی رہیں۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

پھر کسی وقت اس کی آنکھ جھپک گئی۔ گھبرا کر جو اس نے آنکھ کھولی تو صبح کی روشنی چھن کر کھوہ کے اندر آ رہی تھی۔ کھوہ کے منہ پر برف کے فانوس نما بلور جگہ جگہ چھت سے لٹکے ہوئے تھے۔ اور سورج کی کرنیں ان میں ہفت رنگ جھلکیاں دکھا رہی تھیں۔

دلیپ نے کمل کو جگایا۔ دونوں آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے کیونکہ اب زیادہ دیر تک اس کھوہ کے اندر چھپے رہنا موت کو دعوت دینا تھا۔ اب جو کچھ ہوگا وادی کی کھلی سطح پر ہوگا۔ جہاں حرکت دوڑ بھاگ کی زیادہ گنجائش تھی۔

باہر نکل کر دونوں چٹانوں کے عقب کا سہارا لیتے ہوئے گزرتے ہوئے کل کی پناہ گاہ کی طرف چلے، جہاں وہ اپنے تمام ساتھیوں کو چھوڑ کر آئے تھے۔ یکا یک چلتے ہوئے وہ دونوں رک گئے۔

فرشِ زمین پر چار لاشیں پڑی تھیں۔ میجر ہنری ٹالبس ورتھ، جیوتشی نند دلارے، ٹھاکر سنگھ راوت اور ذرا سے فاصلے پر مولچند شاہ۔

دلیپ جھک کر ان لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہ یکا یک کمل نے اسے تیزی سے گھسیٹ کر چٹان کے عقب میں کر لیا۔ عین اسی وقت فائرنگ کی آواز ہوئی۔ گولی چٹان سے ٹکرا کر اور اس کا ایک ٹکڑا توڑتا ہوئی ایک گونج کے ساتھ پلٹ گئی۔

"کون تھا یہ۔۔؟" دلیپ نے پوچھا۔

"تمہارا چچا۔" کمل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
دلیپ چند لمحے حالات کے اس نئے موڑ پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔
"مگر کیوں۔؟ آخر میں اس کا بھتیجا ہوں۔"
کمل نے کہا۔ "اس وقت بحث کا موقع نہیں ہے۔ آؤ ہم تم ایک دوسرے کی قمیص بدل لیں۔ میری نیلی لش شرٹ تم پہن لو۔ تمہاری چیک شرٹ میں پہن لیتی ہوں۔ وہ —— تمہارا چچا مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے گا۔ بائیں طرف سے جا کر چٹانوں کے پیچھے سے گھوم کر اس پر حملہ کر دو۔"
"لیکن وہ مجھ پر حملہ کیوں کریگا۔؟"
"اس لئے کہ تم کو ختم کر دینے کے بعد اس کے لئے مجھے ختم کر دینا بہت آسان ہوگا۔"
"مگر کیوں۔؟"
"یہ بحث کا موقع نہیں ہے۔ جیسا میں کہتی ہوں کرو۔"
دلیپ کو کمل کی تجویز میں وزن نظر آیا۔ دونوں نے اپنی قمیص بدل لیں۔ پھر دونوں مخالف سمت کو چلے۔
کہیں کہیں پر چلتے ہوئے جسونت سنگھ کو چیک شرٹ نظر آجاتی تھی۔ مگر اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی کسی چٹان کے پیچھے چھپ جاتی تھی جسونت سنگھ اس شرٹ کی سیدھ میں چلتے چلتے چٹانوں سے باہر آگیا۔ عین اسی وقت دلیپ پیچھے سے اس پر اچھلا اور اس زور سے کہ اس کا چچا اس کے وزن اور حملے کی طاقت سے اس کے نیچے زمین پر گر گیا۔ اور پستول اس کے ہاتھ سے گر کر

دُور فاصلے پہ جا گرا۔
دلیپ اپنے چچا کے جسم سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ حیرت زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"چچا۔ کیا پاگل ہوئے ہو۔ یہ میں ہوں دلیپ سنگھ تمہارا بھتیجا۔"
اس کا چچا تیزی سے گرے ہوئے پستول کی جانب جانے لگا۔ فوراً چٹان سے باہر نکل کر کمل نے کہا۔ "اسی تمہارے چچا نے ہی تمہارے باپ گلونت سنگھ کا خون کیا تھا۔ ایک سونے کے پترے کی خاطر۔ اس کے ہاتھ میں پستول مت آنے دو۔"
دلیپ نے ٹھوکر مار کر جسونت کا پستول دُور پھینک دیا پھر اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر تیزی سے بولا۔
"کیا یہ سچ ہے چچا۔؟"
چچا بڑی تلخی سے ہنسا۔ کمر سے ایک چاقو نکال کر بولا۔ "میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ جیسے میں نے تمہارے باپ کو ختم کیا تھا۔"
اس کا چچا دانت پیس کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔
دلیپ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔
"مگر کیوں چچا، وہ تمہارا بھائی تھا۔"
"مگر اس نے مجھے اپنا سونے کا پترا دینے سے انکار کیا تھا اور میں اسے قتل کر کے ہندوستان سے باہر بھاگ گیا اور اب تمہاری باری ہے۔ سور کی اولاد......"

چند لمحے دلیپ خاموش سے کھڑا رہا۔ اس کے دل پر جیسے کئی صدیوں کے اندوہناک سائے گھوم گئے۔ پھر یکایک اس کا جبڑا تن گیا۔ دلیپ نے اپنا اور جسونت سنگھ کا پستول کمل کی طرف پھینک دیا۔

"تمہارے پاس صرف ایک چاقو ہے۔ میرے پاس بھی صرف ایک چاقو ہے۔ سامنے آجاؤ۔ میرے باپ کے قاتل۔ اپنے سگے بھائی کے قاتل۔ آج ہم دونوں میں سے کسی ایک کی لاش یہاں ڈھیر ہو گی۔"

جسونت ایک چیخ مار کر دلیپ پر اچھلا۔ جسونت کے ہاتھ کا چاقو ایک لمحے کے لئے اس کے ہاتھ میں چمکا۔ دوسرے لمحے میں دلیپ نے اپنا چاقو اس تیزی سے جسونت پر پھینکا کہ اس کے ہاتھ کی ہتھیلی کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ جسونت کے ہاتھ سے چاقو گر گیا۔ دلیپ نے اپنا چاقو پھینک دیا۔ دونوں اپنی پوری طاقت سے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دلیپ نے دو کسے ہوئے ایسے گھونسے چچا پر رسید کئے کہ جسونت چکرا کر گرنے لگا۔ مگر گرتے گرتے اس نے اس زور کی لات دلیپ کے پیٹ میں ماری کہ دلیپ درد سے کراہتے ہوئے دوہرا ہو گیا۔ یکایک جسونت ایک بھاری چٹان کو لے کر دلیپ پر حملہ آور ہوا مگر عین وقت پر دلیپ نے اپنی جگہ بدل لی۔ اور وہ چٹان بڑی کھوہ کے اندر جا گری دلیپ نے بڑھ کر اپنے چچا کا بازو تھاما اور اسے زور سے موڑ کر جسونت کو پٹخنی دی۔ مگر عین موقع پر دلیپ کی ٹانگ جسونت کی ٹنگڑی سے بل کھا گئی۔ دونوں زمین پر ایک دوسرے پر جا گرے اور ایک دوسرے پر پٹخنیاں کھاتے ہوئے کئی گز برف کو روندتے چلے گئے۔ پھر کمل نے دیکھا کہ جسونت سنگھ دلیپ کے سینے پر چڑھ کر

اس کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جسونت سنگھ کے کندھے کو اپنے پستول کا نشانہ بنانے ہی کو تھی کہ اس نے دیکھا۔ دلیپ نے ایک خطرناک داؤ کے ساتھ اور گہرے غصہ کی گرج کے ساتھ چچا کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اور اسے اپنے سامنے برف کے ایک بڑے تودے پر دے مارا۔ اس کا چچا برف کے اس تودے میں کمر تک دھنس گیا۔ اور اس کا سر تودے سے لگی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ پھر یکایک اس تودے کے اوپر چٹان کے اوپر سے ایک پہاڑی کونے سے لٹکی ہوئی برف خطرناک شور مچاتی ہوئی ہزاروں ٹن کا بوجھ لئے اس پر گری اور اسے ایک گہری قبر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر گئی۔

چند منٹ تک دلیپ اس خوفناک منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اسے متلی سی محسوس ہونے لگی اور وہ چند قدم پیچھے جا کر ایک چٹان کے پیچھے قے کرنے لگا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اور بڑے بڑے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر اس کے چہرے پر رواں تھے۔

کمل اس کے قریب آئی اور دھیرے دھیرے اس کا سر سہلانے لگی۔
دلیپ یکایک مڑ کر اس کے دامن میں اپنا منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگا۔

دن بھر کدالیں لئے ٹنل کا راستہ ڈھونڈتے رہے۔ مگر تازہ برف باری ــــــ اور ہزاروں ٹن برف کے گرنے سے وہ راستہ اب مسدود ہو گیا تھا۔ اور کسی طرح تلاش کرنے سے نہ ملا۔

جب تاریکی بڑھنے لگی تو وہ دونوں تھک ہار کر بڑی کھوہ میں چلے گئے نیند ٹھیک سے نہیں آئی۔ کبھی کمل اکدم گھبرا کر اٹھ جاتی۔ کبھی دلیپ بُرے بُرے خواب دیکھ کر جاگ اٹھتا۔ کسی طرح صبح ہوئی تو دلیپ نے باہر نکل کر ان لاشوں کی طرف دیکھا۔ جن کی جیبوں میں اب بھی لاکھوں روپئے کا سونا ٹھسا پڑا تھا۔ لیکن اب وہ سونا ان سب کے لئے بیکار تھا۔

اس سونے سے دلیپ نے اپنی جیبیں بھر لیں، پھر کمل آ گئی۔ اور دلیپ نے اسے بھی اتنا ہی سونا دیدیا جتنا وہ اٹھا سکتی تھی۔

پھر دلیپ نے ٹنل والے پہاڑ سے لگے ہوئے دوسرے پہاڑ کی طرف دیکھا، جس پر کم برف گری تھی۔ اور اونچی نیچی چٹانیں نوکیلی اور کھُردری اور وحشت ناک، اس پہاڑ کے قدموں سے لے کر چوٹی تک چلی گئی تھیں۔

دلیپ نے کہا۔ "ہم ان چٹانوں کا سہارا لے کر اوپر چڑھتے جائینگے اور چوٹی پر پہونچکر دوسری طرف جانے کا راستہ ڈھونڈیں گے۔ ایک دفعہ چوٹی پر پہونچ گئے تو بیچ جانا مشکل نہ ہوگا۔"

کمل بولی۔ "ہمارے پاس صرف چار دن کا راشن ہے۔"

"بہت ہے۔" دلیپ بولا۔ "احتیاطاً ایک دن میں ایک دفعہ کھائیں گے۔"

دن بھر وہ اس پہاڑ پر چڑھتے رہے مگر اس پہاڑ کی چوٹی تک پہونچ جانا آسان ثابت نہ ہوا۔ کہیں ایسی نوکیلی چٹانیں تھیں کہ ٹخنے چھل جاتے تھے۔ کہیں پر ایسی پھسلواں برف کہ کدالوں کے بغیر قدم جمانا مشکل کام تھا۔ کہیں پر ایسی گہری کھائیاں کہ آہنی سیڑھی اور نائی لان کی ڈوریوں کے بغیر انہیں پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے پاؤں چھل گئے تھے۔ اور ہاتھ زخمی ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ آگے اور اوپر اور اوپر چڑھتے گئے۔

ایک جگہ کمل اس بری طرح سے پھسلی کہ برف پر تیس فٹ کے قریب نیچے چلی گئی۔ بڑی مشکل سے رسیّوں اور ہتھیوں کی مدد سے دلیپ نے اسے واپس نکالا۔

کمل کی جودھپور تین جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اور ایک ران سے خون

جاری تھا۔ دلیپ نے فرسٹ ایڈ کرنے کے بعد پوچھا۔

"چل سکتی ہو۔؟"

کمل نے چلنے کی کوشش کی مگر دبی کراہ کے ساتھ دلیپ کا ہاتھ تھام کر رہ گئی۔

بولی۔" دلیپ تم چلے جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو۔"

دلیپ مسکرایا۔ اس نے کوشش کر کے کمل کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ وہ ناں ناں کرتی ہی رہی مگر دلیپ آہستہ سے کراوپر کی طرف بڑھتا ہی رہا گو اس کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ کیونکہ اوپر جانے کا سفر بے حد خطرناک تھا۔ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھنا پڑتا تھا۔

کوئی تین گھنٹے کی کڑی مسافت کے بعد دلیپ بے دم ہو گیا۔ ایک بڑی چٹان کا سہارا لے کر وہ کمل کو اٹھائے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ کمل کی دونوں باہیں اس کے گلے میں تھیں۔

دلیپ بولا۔"مجھے مضبوطی سے پکڑے رہو۔"

"اچھا۔"

جب کمل نے دلیپ کے جسم کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو دلیپ نے ذرا جھک کر اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور سونے کے سارے ٹکڑوں کو نکال کر نیچے پھینک دیا۔

"یہ کیا کیا تم نے۔؟" کمل نے حیرت سے پوچھا۔

"وزن بھاری ہے۔ اب میں تمہیں اور سونے دونوں کو لیکر نہیں چل سکتا۔

وزن کم کرنا ہوگا۔" دلیپ بولا۔

"تم نے میری جان بچانے کے لئے سونے کے ان قیمتی ٹکڑوں کو پھینک دیا۔؟" کمل حیرت زدہ ہو کر بولی۔

دلیپ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔" تمہاری جان سے زیادہ کیا قیمتی ہے۔" اتنا کہہ کر دلیپ اپنے جوتے کے تسمے ٹھیک کرنے لگا۔

کمل کے بازو زیادہ طاقت سے اس کے گلے میں حمائل ہو گئے۔ وہ اس سے چمٹ سی گئی۔ پھر اس نے اپنے گال دلیپ کے گال سے ملا دیئے اور گہری شدت جذبات سے گلوگیر لہجہ میں بولی۔

"دلیپ، میرے دلیپ۔"

دلیپ اپنے تسمے باندھتا رہا۔

جب وہ دوبارہ کمل کو اٹھا کر چلا تو اسے چلتے چلتے پتھر کے ٹکڑوں کے گرنے کی آواز آئی حالانکہ جہاں پر وہ اس وقت چل رہا تھا وہاں صرف برف تھی۔ اس نے نظر جما کر ان پتھروں کے ٹکڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب سونے کے ٹکڑے تھے۔

دلیپ نے گھبرا کر کہا۔" کیا کر رہی ہو۔؟"

کمل خوشی سے بولی۔" وزن ہلکا کر رہی ہوں۔"

پھر دلیپ نے چلتے چلتے کمل کے جلتے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ اپنے گال پر محسوس کیا۔ یکایک اس کے بدن میں کہیں سے دوگنی طاقت آگئی۔ اور وہ تیزی سے چوٹی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

سات دن تک وہ بھولنے بھٹکتے راستہ ڈھونڈتے رہے۔ چار دن کا راشن جوان کے پاس تھا ختم ہوگیا تھا۔ اب وہ تین دن سے بھوکے تھے۔ ان کے کپڑے پھٹے گئے تھے اور بدن جگہ جگہ سے زخمی ہوگئے تھے۔ بھوک پیاس اور تھکن سے چور، جب ساتویں روز انہیں سائیں ملنگ بابا کا گھر نظر آیا تو ایسا لگا جیسے وہ جنت میں پہونچ گئے ہوں۔

شکستہ پا تھکے ٹوٹے، میلے گندے جب وہ دونوں سائیں کے گھر میں داخل ہوتے ہی گر گئے تو چند لمحوں تک سائیں انہیں پہچان نہ سکا۔ پھر جب اس نے ان دونوں کو پہچان لیا تو جڑی بوٹی لا کر ان کی مرہم پٹی کرنے لگا۔

ملنگ نے کسی بوٹی کا قہوہ تیار کیا اور اس میں ریزہ ریزہ کر کے اس نے مکئی کی روٹی ڈالی حتیٰ کہ وہ اس قہوہ میں گھل گئی۔ پھر ملنگ بابا نے وہ قہوہ

ان دونوں کو پلا دیا۔

قہوہ پی کر ان دونوں کو ایسی نیند آئی کہ دو دن تک برابر سوتے رہے۔ بیچ بیچ میں کبھی ان کی آنکھ کھلتی تو پھر ملنگ انہیں وہی قہوہ پلا دیتا۔

دو دن کے بعد رات کے وقت ان دونوں کو ہوش آیا۔ بابا ایک پرات میں مکئی کا آٹا رکھے اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر ایک روٹی تیار کر رہا تھا۔ چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ طاق پر دیا روشن تھا۔

وہ دونوں ایسی حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھ رہے تھے جیسے انہیں نئی زندگی ملی ہو۔

کمل نے مکئی کی روٹی کی طرف دیکھ کر تھوک نگلا۔ اس کے حلقوم کو اوپر نیچے جاتے دیکھ کر بابا زور سے ہنسا اور بولا۔

"کیوں، بھوک لگی ہے۔؟"

کمل نے آہستہ سے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"اور تم دلیپ۔؟"

دلیپ نے گرسنہ نگاہوں سے روٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی۔"

بابا ہنس کر بولا۔ "کیا کھاؤ گے۔! روٹی کہ سونا۔؟"

"روٹی۔! روٹی۔! روٹی۔!" کمل بالکل بے قرار ہو کر بولی۔

بابا نے چار روٹیاں بڑی بڑی مکئی کی چولہے کے انگاروں پر سینک کر چنگیر میں رکھیں۔ پھر ایک طرف رکھا ہوا جنگلی پودینہ دھو کر سو لنے کی سل

پر پسینے لگا۔ اب کمل کی نگاہیں صرف لستی ہوئی ہری چٹنی پر تھیں۔ سونے کی سطح پر نہ تھیں۔ دلیپ کے منہ میں لعاب آنے لگا۔

بابا نے لکڑی کے ایک پیالے میں چٹنی اور چنگیر میں رکھی چار روٹیاں ان کے سامنے رکھیں۔ دلیپ اور کمل دونوں کے ہاتھ اکدم ایک ہی وقت روٹیوں پر گرے۔ ایک ٹکڑا دلیپ کے ہاتھ آیا دوسرا کمل کے ہاتھ۔ دونوں ان ٹکڑوں پر چٹنی لگا کے کھانے لگے۔

آہستہ آہستہ اگلے دس پندرہ دنوں میں ان کی طاقت عود کر آئی۔ ان کے زخم مندمل ہو گئے۔ بدن میں جوانی کی چمک اور اس کی شگفتگی پھر سے لوٹ آئی۔ اب وہ دن میں دو دو گھنٹے جھیل کے کنارے سنہری ریت پر دھوپ سینکتے رہتے۔ گھنٹوں اس کے نیم گرم پانی میں تیرتے ڈبکیاں لگاتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ شرط بد کر تیرتے۔ پانی میں وہ دو خوب صورت مچھلیوں کی طرح تھے۔ اور ساحل پر دو وحشی ہرنوں کی طرح۔ وادی کے بیچ میں یہ جھیل کی کٹوری، چاروں طرف جنگل کا سبزہ زار، اوپر نیلا آسمان، اندر ایک طمانیت، سکون، شانتی احساس پیار کا، رفاقت کا، زندگی اور فطرت سے مطابقت کا۔

ان پندرہ دنوں میں وہ دونوں بابا کی عزّت کرنے لگے تھے۔ ایسا پیار جو بچے اپنے باپ کو دے سکتے ہیں۔ رات کو کھانا کھا لینے کے بعد اور سونے سے پہلے وہ ہر روز ملنگ بابا سے مثنوی مولانا روم سنتے تھے۔ بابا نے شاید اسے ہزاروں بار سنا تھا، پھر بھی اس کے لئے معنی ہر مرتبہ نئے تھے۔ اور بابا کے سریلے گلے سے اس کے بول سنتے سنتے اور اس کی تشریح سمجھتے سمجھتے ان

دونوں بچوں کو بھی یہی معلوم ہوتا جیسے ان پر فطرت کا الہام اتر رہا ہے۔

پندرہ دنوں کے بعد جب وہ پھر سے بالکل چست چاق و چوبند ہو گئے تو انہوں نے واپس تہذیب اور سماج کی زندگی میں جانے کی ٹھانی۔ بابا نے بڑی محبت سے انہیں رخصت کیا۔ وہ دن کا کھانا ان کے ساتھ کر دیا۔ ان کا ماتھا چوما۔ پھر اپنی آنکھوں میں محبت اور شکرانے کے آنسو لئے واپس اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔

اب وہ دونوں بابا کے بتائے ہوئے راستہ پر جھیل سے ذرا اوپر تک
ایک پگڈنڈی پر یوس مرگ کی جانب جا رہے تھے۔ یکایک کمل نے رک کر اپنی
جودھپوری کی جیب سے کان کا نقشہ نکالا اور اسے دلیپ کو دکھا کر بولی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ دوسری بار پھر اس نقشے کے
راستہ پر زیادہ تیاری سے آسکتے ہیں۔ دلیپ۔!"

کمل نے دلیپ کو سونے کا گول توا دیا۔ جس پر کان کا نقشہ کھدا
ہوا تھا۔

دلیپ نے چند لمحوں کے لئے تامل کیا، پھر سونے کے اس توے کو
لہرا کر نیچے جھیل میں پھینک دیا۔

جھیل کی سطح کو چیرتا ہوا سونے کا توا جھیل کے پانیوں میں ڈوب گیا۔

چند لہریں اس کے چاروں طرف اٹھیں۔ لہروں کے مدور گھیرے پانی کی سطح پر گھومتے ہوئے جھیل کے ساحلوں کی جانب بڑھتے گئے۔ پھر وہ لہریں بھی ساحل سے ٹکرا کر غائب ہو گئیں۔ پھر جھیل کے پانیوں پر سکوت سا چھا گیا۔

کمل دیر تک خاموشی سے دلیپ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ تم نے کیا کیا۔؟"

دلیپ بولا۔

"جس سونے کی کان کے لئے بھائی، بھائی کی جان لے لے اور دوست دوست کا گلا کاٹ ڈالے، مجھے اس سونے کی کان کا ایک ٹکڑا بھی نہیں چاہیئے۔ زندگی سونے سے زیادہ قیمتی ہے اور محبت سے بڑھ کر کوئی سونا نہیں ہے۔ اور یہ وہ سونا ہے جو ایک دوسرے پر نچھاور کرنے سے اور بڑھتا ہے۔ ملنگ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سونے کی کان تو دراصل انسان کی رُوح کے اندر پوشیدہ ہے۔!"

پھر دلیپ نے کمل کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنا ہاتھ اور اس کا ہاتھ دونوں فضا میں اٹھا کر مسرّت بھرے لہجہ میں کہا۔

"ہم دونوں اب اپنے ہاتھوں کی محنت کے سونے سے ہی نیا سنسار بسائیں گے۔"

یکایک کسی نئی سمجھ سے کمل کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اور وہ اکدم دلیپ سے لپٹ گئی۔ چند خوش نصیب ساعتوں کے لئے وہ ایک دوسرے سے

لگے لگے اکٹھے کھڑے رہے۔ پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے زندگی کے
نئے راستہ پر چلتے گئے۔

تمام شد